مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۹ | محرم الحرام ۱۴۴۰ھ | اکتوبر ۲۰۱۸ء | شمارہ ۱۰

جمال الجلیل

رحمت الٰہی کا ظہور

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے زر سالانہ =/۴۰۰ روپے

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس

۱۳/۲۰ اریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت

جامعہ دار العلوم الاسلامیہ (رجسٹرڈ) لاہور پاکستان

ماہنامہ الامداد لاہور

35422213
35433049

پتہ دفتر

جامعہ دار العلوم الاسلامیہ (رجسٹرڈ)

۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

جمال الجلیل (رحمت الٰہی کا ظہور)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	تمہید	۷
۲	ہوا کی اہمیت	۸
۳	ضروری اشیاء	۹
۴	ایمان کی اہمیت	۱۰
۵	ارکان اسلام	۱۱
۶	حقیقت اذکار	۱۲
۷	کافر کا حرص	۱۳
۸	کافر اور متاع دنیا	۱۵
۹	خاصیت ایمان	۱۶
۱۰	مومن کا خاصہ	۱۸
۱۱	مقدار غذائے جسمانی	۲۰
۱۲	اوسط کی حقیقت	۲۱
۱۳	تشبہ بالملئکہ	۲۳
۱۴	شعراء کا ذوق	۲۳
۱۵	چائے میں برف	۲۵
۱۶	کھانے کی رعایت	۲۶
۱۷	جمعیت قلب	۲۷
۱۸	کلام کی اقسام	۲۸
۱۹	عملی تعلیم	۳۰
۲۰	قرأت اور موسیقی	۳۱
۲۱	بے سود سوال	۳۲
۲۲	ایک قاعدہ کلیہ	۳۳
۲۳	نیت کا فرق	۳۵

۲۴.........	اصلاح کی صورت.........	۳۷
۲۵.........	راحت دین ودنیا.........	۳۸
۲۶.........	غرض وغایت.........	۴۰
۲۷.........	مسئلہ قدر.........	۴۱
۲۸.........	اطاعت شیخ.........	۴۳
۲۹.........	دخلِ ترغیب وترہیب.........	۴۴
۳۰.........	گستاخی اور دلیری.........	۴۵
۳۱.........	عنایت کی انتہاء.........	۴۷
۳۲.........	رحمت کی صورت.........	۴۸
۳۳.........	اثر خوف ورجا.........	۵۰
۳۴.........	مغفرت ورحمت حق.........	۵۱
۳۵.........	فرق فعل اور صفت.........	۵۳
۳۶.........	خوف کی حد.........	۵۴
۳۷.........	افراط خوف کا اثر.........	۵۶
۳۸.........	خوف کی حقیقت.........	۵۷
۳۹.........	حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی فراست.........	۵۸
۴۰.........	جنسِ ایمان.........	۵۹
۴۱.........	جاہلانہ نکتہ.........	۶۰
۴۲.........	درجہ اشتراک ودرجہ مساوات میں فرق.........	۶۱
۴۳.........	شرط ایمان.........	۶۱
۴۴.........	نفس کی حقیقت.........	۶۲
۴۵.........	درجات خوف ورجاء.........	۶۲
۴۶.........	غالب علی الاحوال.........	۶۳
۴۷.........	ہیبت کا چرکہ.........	۶۳
۴۸.........	خلاصہ بیان.........	۶۶

وعظ

جمال الجلیل
(رحمت الٰہی کا ظہور)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ امابعد

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے ترغیب وترہیب کے متعلق یہ وعظ ۱۲ شوال ۱۳۴۵ھ یک شنبہ کو اپنے گھر میں کرسی پر بیٹھ کر چار گھنٹے ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد مستورات کے علاوہ تیس تھی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب نے اسے قلمبند فرمایا۔ انسان پر دو کیفیات طاری ہوتی ہیں خوف ورجاء۔ ان کی حقیقت کو واضح کر کے درجہ مطلوب کی نشاندہی کی گئی۔ اس وعظ میں بہت عمدہ مضامین مذکور ہیں اگرچہ آخر میں کچھ تصوف کا رنگ غالب ہوگیا جو سالکین کے لیے مفید مضامین کا باعث ہوا۔

اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو حسب توفیق مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی
۱۵/۷/۲۰۱۸

اعتذار:

گذشتہ ماہ کا رسالہ سلوٰۃ الحزین (غمزدہ کی تسلی) میں چند رسائل میں چند صفحات چھپنے سے رہ گئے یا بائنڈر نے تقدم تاخر کر دیا ہے جس کے لیے ادارہ آپ سے معذرت خواہ ہے اگر آپ کے پاس اس قسم کا رسالہ پہنچا ہو تو ہمیں اطلاع دیدیں صحیح کاپی بھجوادی جائیگی۔

(ادارہ)

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد:

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

{نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۙ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ}(۱)

تمہید

چونکہ یہ بیان ایک مہمان کی فرمائش سے ہو رہا ہے اور فرمائش ہے خاص، اس لیے مضمون بھی خاص ہوگا جس کا مقتضی تقلیل ہے(۲) اس لیے خیال یہ ہے کہ بیان مختصر ہی ہوگا اور اسی واسطے مضمون بھی سہل (۳) اختیار کیا ہے تاکہ صاحب فرمائش کو فہم (۴) میں آسانی ہو اور اصل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے علوم تو فی نفسہٖ سہل ہی ہوتے ہیں وقت وغموض مقدمات (۵) ومبادی کی وجہ سے ہوجاتا ہے ورنہ مقاصد سہل ہی ہوتے ہیں جن کو شہری اور دیہاتی عورتیں اور مرد جاہل اور فلسفی سب کے سب آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں، مقاصد شرعیہ میں کوئی غموض (۶) اور پیچیدگی نہیں ہے۔ ہاں جب ان پر دلائل قائم کئے جائیں اور ان کے مقدمات ومبادی پر کلام کیا جائے تو اس وقت دقت وغموض ہوجاتا ہے مگر دلائل ومقدمات قائم کرنے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ بعض لوگ ان

(۱) ”اے رسول اکرم ﷺ آپ میرے بندوں کو اطلاع دے دیجئے کہ میں بڑا مغفرت اور رحمت والا ہوں اور نیز یہ کہ میری سزا دردناک سزا ہے“ سورۃ الحجر ۴۹۔۵۰ (۲) اس کا تقاضہ یہ ہے کہ مضمون مختصر ہو (۳) آسان (۴) سمجھنے میں (۵) مشکل تو مقدمات کی وجہ سے ہوجاتے ہیں (۶) مشکل نہیں۔

مقاصد میں شبہات نکالنے لگتے ہیں اگر شبہات نہ پیدا کئے جائیں تو نفس مقاصد، علوم انبیاء میں سہل و آسان ہی ہوتے ہیں اور یہی رنگ اُن حضرات کے علوم کا ہے جو وارثان انبیاء علیہم السلام ہیں اسی واسطے محققین کے علوم ان کی ابتدائی حالت میں تو غامض ودقیق (۱) ہوا کرتے ہیں اور انتہاء میں اُن کا مرجع بھی (۲) سہولت ہی کی طرف ہوجاتا ہے کیونکہ ابتداء میں ان کے اندر وراثت نبوت کامل نہیں ہوتی، انتہاء میں جب وہ مظہر علوم انبیاء ہوجاتے ہیں ان کے علوم سہل ہوجاتے ہیں۔ جبکہ ابتداء کلام کی اُن کی جانب سے ہو اور اگر ابتداء کسی دوسرے کی طرف سے ہو تو اُس کے جواب میں دقت وغموض ہونا (۳) اور بات ہے کیونکہ اس وقت معترض کے شبہ کی وجہ سے ان کو دلائل مقدمات سے تعرض کرنا پڑتا ہے اور میں بتلا چکا ہوں کہ مقاصد میں مقدمات ومبادی کی وجہ سے غموض ہوجاتا ہے اور جس طرح سلسلہ تشریع (۴) میں جو علوم زیادہ نافع ہوتے ہیں وہی زیادہ سہل ہوتے ہیں اسی طرح سلسلہ تکوین (۵) میں بھی یہی قانون ہے کہ جتنی اشیاء زیادہ ضروری ہیں وہ نہایت سہل ہیں۔

ہوا کی اہمیت

چنانچہ اسی سلسلہ تکوین میں سب سے زیادہ ضروری ہوا ہے دیکھئے وہ سب سے زیادہ سہل الحصول ہے (۶) کہ اس کے استعمال کے لیے ارادہ واختیار کی بھی ضرورت نہیں ورنہ زندگی موت ہوجاتی کیونکہ قاعدہ ہے کہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہوسکتا اور ایک وقت میں دو کام نہیں ہوسکتے تو اگر سانس لینے کے لیے ارادہ واختیار کی ضرورت ہوا کرتی تو دنیا کے اور کام بالکل ہی نہ ہوسکتے، بات کرنا چاہتے تو ایک طرف بات کا ارادہ کرنا پڑتا اور دوسری طرف سانس لینے کا ارادہ کرنا پڑتا اور دو طرف توجہ نہ ہوسکتی تو بات کرنا مشکل ہوجاتا اور سونا تو موت ہوجاتا کیونکہ سونے کی حالت میں سانس کا ارادہ اور قصد سخت ہی مشکل ہے اگر سانس لینا ہمارے ارادہ پر موقوف ہوتا تو بس ساری رات بیٹھے ہوئے سانس ہی لیا کرتے پھر سونا کس وقت ہوتا، پس یہ کس قدر حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ جس چیز پر ہماری حیات (۷) موقوف تھی، اس کو ہمارے ارادہ واختیار پر

---

(۱) مشکل ہوتے ہیں (۲) وہ بھی آسان کرکے بیان کرتے ہیں (۳) مشکل وگہرائی ہونا (۴) احکام شرعیہ (۵) احکام تکوینیہ (۶) بآسانی مل جاتی ہے (۷) زندگی کا مدار تھا۔

موقوف نہیں رکھا بلکہ ایسا اضطراری بنادیا کہ وہ بدوں قصد (۱) وارادہ کے برابر جاری رہتا ہے۔ اس کی طرف ہم کو توجہ کی بھی ضرورت نہیں، اس لیے سونا بھی آسان ہوگیا اور دوسرے کاموں میں بھی توجہ کرنا سہل ہوگیا اور یہ سانس ایسا اضطراری امر ہے کہ اس کے لینے میں ارادہ کی بھی ضرورت نہیں بلکہ اگر بند کرنا چاہو تو اس کے لیے ارادہ کرنا پڑتا ہے اور اس ارادہ میں بھی پوری کامیابی نہیں ہوتی کیونکہ اس کے روکنے میں سخت تکلیف ہوتی ہے ذرا سی دیر میں جی تنگ ہونے لگتا ہے غرض جب سانس میں ہوا کا لینا ایسا ضروری تھا تو حق تعالیٰ نے اُس کا سامان بھی اتنا سہل کردیا کہ اس کی تحصیل میں کوشش کی بھی ضرورت نہیں چنانچہ ہر جگہ ہوا موجود ہے اور جو آسمان میں بھری ہوئی ہے جو سانس کے ساتھ ہر وقت آمدورفت کرتی رہتی ہے گو تکثیر ہوا (۲) کے لیے اسباب کی ضرورت ہو مثلاً گرمی کے وقت زیادہ ہوا حاصل کرنے کے لیے پنکھا جھلنا پڑتا ہے مگر تکثیر ہوا پر حیات موقوف نہیں صرف راحت موقوف ہے اور سانس کے لیے جتنی ہوا کی ضرورت ہے اس کے لیے کسی سامان کی ضرورت نہیں۔

ضروری اشیاء

اس کے بعد پانی کا درجہ ہے کہ اس پر بھی حیات موقوف ہے یہ ہوا سے کسی قدر دشوار ہے (۳) کہ اس میں ارادہ واختیار واستعمال کی بھی ضرورت ہے۔ اور بعض دفعہ چل کر لانا بھی پڑتا ہے کیونکہ یہ ہر جگہ موجود نہیں اور بعض دفعہ خریدنا بھی پڑتا ہے، ہوا میں اس کی بھی ضرورت نہیں وہ ہر جگہ موجود ہے اسی طرح غذا میں جن چیزوں کی ضرورت زیادہ ہے وہ اور اشیاء سے سہل ہیں اور جو چیزیں سب سے زیادہ غیر ضروری ہیں وہ سب سے زیادہ صعب الحصول ہیں (۴) یعنی جواہرات کہ نہ کھانے کے نہ پینے کے نہ اوڑھنے کے نہ بچھانے کے ان پر زندگی کا کوئی کام بھی اٹکا ہوا نہیں چنانچہ بہت سے آدمیوں نے عمر بھر بھی ان کی صورت نہ دیکھی ہوگی مجھے خود اپنا قصہ یاد ہے کہ عمر بھر میں ایک دفعہ میں نے ان کی زیارت کی ہے۔ لکھنؤ میں میرے ایک دوست جواہرات کی

---

(۱) بلا ارادہ (۲) زیادہ ہوا حاصل کرنے کے لیے (۳) اس کا حصول تھوڑا مشکل ہے (۴) ان کا حصول سب سے مشکل ہے۔

تجارت کرتے تھے میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے ساتھ کچھ جواہرات ہوں تو ہم کو بھی دکھلا دو اس کے بعد انہوں نے ایک ڈبیہ جیب میں سے نکالی جس میں ہزاروں روپیہ کے جواہرات تھے، میں نے اس روز اُن کی شکل دیکھی ہے، پھر جو سب سے زیادہ قیمتی موتی ہے وہ سم قاتل ہے(۱) جو دوا کے بھی کام میں نہیں آتا، یعنی ہیرا اور جو جواہرات کسی کے نزدیک دوا میں کام آتے ہیں جیسے یاقوت ویشب وغیرہ وہ ہیرے سے ارزاں ہیں (۲) مگر اور دواؤں سے یہ بھی قیمتی ہیں کیونکہ ان کا دوا ہونا مختلف فیہ ہے اطباء ان کو دوا مانتے ہیں اور ڈاکٹر ان کو دَوا نہیں مانتے تو یہ تکوین میں سہولت کا بیان تھا۔

ایمان کی اہمیت

اب تشریع میں دیکھئے کہ سب سے زیادہ ضروری ایمان ہے، اس میں اس قدر سہولت ہے کہ عمر بھر میں ایک بار کلمہ شریف کا اعتقاد کر لینا اور زبان سے کہہ لینا کافی ہے تکرار استحضار و اظہار کی ''نجات مطلقہ'' کے لیے ضرورت نہیں صرف اتنا ضروری ہے کہ ایک مرتبہ دل سے اس کا اعتقاد و اظہار کر کے کسی وقت اس کی ضد کا اعتقاد و اظہار نہ ہو(۳) باقی ہر وقت اس اعتقاد کا استحضار مکمل ایمان تو ہے جس سے درجات میں ترقی ہوگی باقی نجات مطلقہ کا موقوف علیہ نہیں اور اگر کسی کو عمر بھر میں ایک بار بھی زبان سے اس اظہار کی قدرت نہ ملی ہو تو دل میں تصدیق کر لینا ہی کافی ہے، اگر قدرت ہو تو پھر عدم اظہار میں اختلاف ہے کہ اس وقت محض تصدیق قلبی عنداللہ ایمان معتبر ہے یا نہیں؟ مذہب منصور (اور صحیح قول) یہ ہے کہ عنداللہ یہ بھی ایمان معتبر ہے مگر باوجود قدرت کے عدم اظہار معصیت ہے(۴) جس کا گناہ ہوگا اور عندالناس یہ شخص احکام ظاہرہ میں کافر ہوگا کیونکہ ہم کو بدوں اظہار کے ایمان کا علم نہیں ہوسکتا اور علم ہو بھی جائے تو چونکہ اس نے باوجود قدرت کے ایمان ظاہر نہیں کیا اس لیے ہم اس کو احکام دنیا میں مومن نہیں کہہ سکتے نہ اس کے جنازہ کی نماز پڑھیں گے نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کریں گے مگر عنداللہ یہ شخص مومن ہے گو عاصی بھی ہے تو دیکھئے ایمان میں کس قدر سہولت ہے کہ عنداللہ محض

(۱) مار دینے والا زہر ہے (۲) سستے (۳) یعنی کفر کا اعتقاد اور کفریہ کلمہ منہ سے نہ نکالے (۴) قدرت کے باوجود ایمان کا اظہار نہ کرنا گناہ ہے۔

تصدیق قلبی بھی معتبر ہے اور نجات مطلقہ کے لیے تکرار استحضار و اظہار کی ضرورت نہیں۔

ارکان اسلام

اس کے بعد ارکان اسلام کو دیکھیے جو شعائر اسلام ہیں کہ ایمان کے بعد اُن کا درجہ ہے یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج وغیرہ ان میں چونکہ نماز روزہ سب سے زیادہ عام ہیں کہ ہر بالغ ان کا مکلف ہے(۱) تو یہ سب سے زیادہ سہل ہیں، روزہ تو سہل ہے ہی کیونکہ اس کی حقیقت ترک ہے جس میں کچھ کرنا نہیں پڑتا صرف کھانا پینا وغیرہ چند اشیاء کو ترک کرنا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ ترک بنسبت فعل کے سہل ہے(۲) سہولت صوم کے متعلق میرا ایک بیان نہایت مبسوط(۳) ہو چکا ہے جس میں یہ مسئلہ اچھی طرح ثابت کر دیا گیا ہے۔ نماز میں بعض قیود کی وجہ سے البتہ کچھ دِقت ہے اسی لیے ارشاد ہے: وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ روزہ میں کچھ بھی دقت نہیں، اسی لیے روزہ کا حکم بیان فرمانے کے بعد حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں {يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ}(۴) گو یہ ارشاد جملہ احکام کو عام ہے لیکن اس حکم عام کو روزہ کے باب میں بیان فرمانا اس کو مقتضی ہے کہ روزہ کے ساتھ یسر(۵) کو خاص خصوصیت ہے روزہ کے سہل ہونے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ مستورات اس کے لیے بہت باہمت ہیں حالانکہ وہ مردوں سے ضعیف ہیں اور نماز سے عورتیں چور ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ روزہ میں کچھ کرنا نہیں پڑتا چنانچہ کوئی ذکر روزہ کا جزو و رکن نہیں ہے۔ ہاں تکثیر ذکر موجب کمال صوم ضرور ہے رہی نیت صوم وہ اگرچہ وجودی شئے ہے مگر اس میں دقت ہی کیا ہے، پھر بھی وہ صوم کی شرط اور اُس سے مقدم ہے جزو صوم نہیں، اگر جزو ہوتی تو صوم سے مقدم کس طرح ہوتی اور نماز میں اذکار کو جزو بنایا گیا ہے چنانچہ تکبیر تحریمہ بعض کے نزدیک رکن ہے اور ہمارے نزدیک شرطِ مقدم ہے اور قرأت اتفاقاً رکن داخلی ہے اور تشہد واجب ہے اس لیے نماز گونہ(۶) بہ نسبت صوم کے دشوار ہے مگر فی نفسہ دشوار نہیں(۷) بلکہ سہل ہی ہے کیونکہ اس میں کوئی

(۱) پابند ہے (۲) آسان (۳) تفصیلی (۴) ”اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتے ہیں اور تمہارے لیے دشواری نہیں چاہتے“ البقرۃ: ۱۸۵ (۵) آسانی (۶) روزہ کے مقابلے میں نماز کی پابندی مشکل ہے (۷) اگرچہ اپنی ذات میں نماز مشکل نہیں۔

ایسی بات نہیں ہے جس سے تکان ہو، پریشانی ہو کوئی بوجھ اٹھانا نہیں پڑتا۔

حقیقت اذکار

رہے اذکار تو وہ گو رکن صلوٰۃ ہیں مگر دشوار نہیں کیونکہ اذکار کی حقیقت ذکر اللہ ہے اور اللہ کی یاد سبب راحت ہے چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: {اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب}(۱) مریض کے دل سے پوچھو کہ بیماری میں ذکر اللہ کو خود دل چاہتا ہے بے ساختہ زبان سے اللہ اللہ نکلتا ہے اور اس سے ایسی راحت پہنچتی ہے گویا بوجھ اُتر گیا اگر ذرا بھی حس ہو تو خود معلوم ہو جائے گا کہ واقعی ذکر اللہ راحت ہے اور صوفیہ کے واقعات تو اس پر شاہد عدل ہیں کہ ذکر اللہ اُن کی غذا بن جاتا ہے اور غذائے جسمانی کا کام دیتا ہے۔ مشاہدہ ہے کہ ذکر اللہ کرنے والے کی غذائے جسمانی کم ہو جاتی ہے یعنی ذکر اللہ میں مشغول ہونے سے پہلے جس قدر اس کی غذا تھی اس سے اب کم ہو جائے گی، یہ مطلب نہیں کہ اس کی غذا ہر شخص سے کم ہو جائے گی اور دنیا میں کوئی اس سے کم کھانے والا نہ ہوگا نہیں بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ خود اس شخص کی غذا جو ذکر سے پہلے تھی بعد اشتغال بالذکر کے کم ہو جائے گی اور یہی جواب ہے اس اشکال کا جو حدیث پر کیا گیا ہے "المؤمن یاکل فی مع واحد والکافر یاکل فی سبعة امعاء" حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ مسلمان ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان کی خوراک کافر سے کم ہوتی ہے، اس پر بعض کو اشکال پیش آیا ہے کہ ہم تو بعض مسلمانوں کی خوراک کافروں سے زیادہ دیکھتے ہیں جواب یہ ہے کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ ہر مسلمان کی خوراک ہر کافر سے کم ہوتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر کافر مسلمان ہو جائے تو اسلام کے بعد اس کی خوراک پہلے سے گھٹ جائے گی اور کفر کی حالت میں وہ جتنا کھاتا تھا اب اس سے کم کھائے گا جس کی وجہ یہ ہے کہ کفر میں خاصہ ہے کہ اس سے دنیا کی حرص بڑھتی ہے کافر کھانے کے وقت صرف پیٹ ہی نہیں بھرتا بلکہ نیت بھی بھرتا ہے اور مسلمان صرف پیٹ بھرتا ہے۔ اگر کسی کو اس جگہ یہ

(۱) "یاد رکھو کہ دلوں کو اطمینان صرف اللہ کی یاد سے حاصل ہوتا ہے" سورۃ الرعد: ۲۸۔

سوال پیدا ہو کہ تم نے تو حدیث کا مطلب ایسا بیان کیا کہ جس کے سمجھنے کے لیے کسی کافر کے اسلام کا انتظار کرنا پڑے گا تو میں جواب میں عرض کرتا ہوں کہ اگر تم کافر کے اسلام کا انتظار نہ کر سکو تو اس کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم دو آدمی یکساں تن وتوش (۱) کے ایک حالت کے لے لو ایک مسلمان ایک کافر پھر اُن کی خوراک کا موازنہ کرو تو یقینا مسلمان کو کافر سے کم خوراک والا پاؤ گے اور تم کو جو اس میں اشکال ہوا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ تم نے بعض جگہ صرف یہ دیکھ لیا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہے، دوسرا کافر ہے اور مسلمان کی خوراک کافر سے زیادہ ہے۔ یہ نہیں دیکھا کہ مسلمان تندرست مضبوط وتوانا ہے اور کافر کمزور ہے یا مسلمان کئی وقت کا فاقہ زدہ ہے اور کافر فاقہ زدہ نہیں یا مسلمان تو پوری خوراک کھا رہا ہے اور بچانے کی فکر نہیں کرتا اور کافر اپنی پوری خوراک نہیں کھا رہا بلکہ بخل کی وجہ سے پیٹ کا ٹکڑا کفایت (۲) کرنا چاہتا ہے تو ایسی اختلافی حالت میں موازنہ نہیں ہو سکتا بلکہ موازنہ کی صورت وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کی کہ جس قوت وصحت وجسم کا مسلمان ہو اسی جیسا کافر بھی ہو اور دونوں یکساں حالت میں ہوں ایک دوسرے سے زیادہ فاقہ زدہ نہ ہو اور دونوں اپنی خوراک کے موافق کھا رہے ہوں کوئی بچت اور کفایت کے درپے نہ ہو جس کی سہل (۳) صورت یہ ہے کہ دونوں کو دعوت کے موقع پر دیکھو یا خود دعوت کرو اُس وقت معلوم ہوگا کہ واقعی مسلمان کافر سے کم کھاتا ہے اور جس طرح اسلام سے خوراک کم ہو جاتی ہے اسی طرح حرص مال بھی کم ہو جاتی ہے۔

کافر کا حرص

کافر مال کا زیادہ حریص ہے کیونکہ کفر میں طلب دنیا کا خاصہ ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ کافر تو دنیا ہی کو جانتا ہے آخرت کو نہیں مانتا اس لیے وہ دنیا کا حریص نہ ہو تو اور کس چیز کا حریص ہو اور مسلمان آخرت کو بھی مانتے ہیں اس لیے وہ دنیا کے زیادہ حریص نہیں ہوتے اسی لیے مسلمانوں میں افلاس (۴) زیادہ ہے کیونکہ ان کو فکرِ کسب (۵) نہیں ورنہ کیا مسلمانوں کو کمانا نہیں آتا کمانا تو ایسا آتا ہے کہ بعض مسلمان قوموں نے کافروں کو بھی ہرا دیا

(۱) ایک سی قد وقامت کے دو آدمی لے لو (۲) بچانا چاہتا ہے (۳) آسان صورت (۴) غربت (۵) کمانے کی فکر نہیں۔

لیکن عام طور پر مسلمانوں کو کمانے کی فکر نہیں بخلاف کفار کے کہ وہ ہر دم اسی فکر میں رہتے ہیں۔

چنانچہ انبیٹہ کا قصہ ہے کہ میں بہلی میں سوار ہو کر وہاں سے گزر رہا تھا تو سرکاری سکول سے دو لڑکے سیر و تفریح کو نکلے جن میں سے ایک مسلمان کا لڑکا تھا ایک ہندو کا، اور دونوں کے پاس ایک ایک پیسہ تھا جوان کو گھر سے ملا ہوگا دونوں نے صلاح کی کہ اس پیسہ کا کچھ لے کر کھانا چاہئے پھر مشورہ ہوا کہ کیا لینا چاہئے مسلمان لڑکے نے کہا کہ ہم تو اس کا پیڑا لیں گے، ہندو لڑکا بولا کہ ہم تو سنگھاڑے لیں گے تا کہ پیٹ میں کچھ بوجھ تو ہو اس کو بچپن سے ہی اس کی فکر تھی کہ کسی صورت سے روٹی کی بچت کرنا چاہئے بخلاف مسلمانوں کے انہوں نے اس کا سبق ہی نہیں پڑھا، بس جو آیا کھایا اڑایا اور اس کی وجہ وہی ہے کہ کفار میں دنیا کی حرص مسلمانوں سے زیادہ ہے، حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمہ اللہ نے قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ (۱) کی تفسیر میں ایک لطیف بات فرمائی ہے اس آیت میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ فَاُمَتِّعُهٗ کو ماقبل سے اعرابا کیا تعلق ہے، بعض نے کہا ہے کہ فَاُمَتِّعُهٗ کلام مستانف ہے اور مَنْ كَفَرَ، فعل مقدر کا مفعول ہے تقدیر یوں ہے وَارْزُقُ مَنْ كَفَرَ کہ میں کافروں کو بھی رزق دوں گا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں مومنین کی تخصیص کی تھی، وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (۲) حق تعالیٰ نے وَمَنْ كَفَرَ بڑھا دیا کہ دعائے رزق کو مومنین کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں کفار بھی شریک ہوں گے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ تخصیص ادبا کی تھی کیونکہ اس سے پہلی دعا میں انہوں نے تعمیم (۳) فرمائی تھی قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ (۴) جس کو حق تعالیٰ نے مومنین کے ساتھ خاص کر دیا تھا تو اب انہوں نے دوسری دعا کو خود ہی مومنین کے ساتھ خاص کر دیا، حق تعالیٰ نے جتلا دیا کہ اس کو خاص کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ رزق تو میں سب کو دوں گا۔

(۱) ''ایسے شخص کو جو کافر ہے تو آرام برتاؤں گا'' سورۃ البقرۃ: ۱۲۶ (۲) ''اور پھلوں میں سے انہیں رزق عطا فرمایا جوان میں سے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آخرت کے دن پر'' (۳) پہلی دعا میں عموم تھا کافر مومن سب کے لیے (۴) ''انہوں نے عرض کیا اور میری اولاد میں سے بھی''۔

کافر اور متاع دنیا

اس کے بعد فَاُمَتِّعُهٗ (پس اس کو فائدہ پہنچاؤں گا) سے کافر کو رزق دینے کی تفصیل ہے کہ اس کو صرف دنیا میں رزق دیا جائے گا آخرت کے رزق سے وہ محروم ہے اور بعض نے کہا ہے کہ فَاُمَتِّعُهٗ خبر ہی مَنْ كَفَرَ کی اب اس پر سوال ہوتا ہے کہ خبر پر فاء اس وقت داخل ہوتی ہے جبکہ مبتدا میں معنی شرطیت کے ہوں اور مبتدا سبب ہو خبر کے لیے تو لازم آئے گا کہ کفر کو تمتیع (۱) میں دخل ہو جمہور نے تو اس لازم کا التزام نہیں کیا اور یوں کہا کہ محض فائدہ کے لیے ہے ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ (پھر اس کو کشاں کشاں عذاب دوزخ میں پہنچاؤں گا) اور فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا (پس اس کو تھوڑے روز بہت آرام برتاؤں گا) اس کی تمہید ہے جس پر فاء اس لیے داخل ہوگئی کہ مبتدا فَاُمَتِّعُهٗ کے معطوف میں دخل ہے گو معطوف علیہ میں دخل نہ ہو مگر مقصود معطوف ہے معطوف علیہ محض اس کی تمہید ہے لیکن قاضی ثناء اللہ صاحب نے فرمایا ہے کہ اس تکلف کی ضرورت نہیں بلکہ مَنْ كَفَرَ کو فَاُمَتِّعُهٗ کے ساتھ ہی شرطیت کا علاقہ ہے اور کفر کو تمتیع دنیا میں دخل ہے، متاع دنیا کامل طور پر کافر ہی کو دی جاتی ہے کیونکہ وہ آخرت کا قائل نہیں اس لیے ہمہ تن دنیا میں منہمک ہوتا ہے اور ہر وقت اسی دھن میں رہتا ہے کہ دنیا میں ترقی کیونکر ہو اور مال کس طرح جمع کیا جائے تو دنیا کی تمتیع (۲) اسی کے لیے ہوئی ہے، بخلاف مسلمان کے کہ اس کو اسلام انہماک فی الدنیا سے مانع ہوتا ہے (۳)، اس لیے اس کو تمتیع دنیا کافر سے کم ہوتی ہے اور دوسرے کافر تو دنیا میں محض دنیا کو مقصود سمجھ کر اس میں مشغول ہوتا ہے تو اس کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ دنیا ہی دنیا ہے بخلاف مسلمان کے کہ وہ دنیا کو مقصود سمجھ کر اس میں مشغول نہیں ہوتا بلکہ ذریعہ اعمال آخرت اور ذریعہ ادائے حقوق سمجھ کر مشغول ہوتا ہے تو اس کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ دنیائے محضہ نہیں بلکہ چونکہ وہ اس کو مقدمہ آخرت بناتا ہے اس کے لیے یہ متاع دنیا بھی متاع آخرت ہے، لان مقدمة

(۱) فائدہ پہنچانے میں کفر کو دخل ہو (۲) دنیا کا فائدہ اسی کے لیے ہوا (۳) دنیا میں مکمل طور پر مشغول ہونے سے اسلام روکتا ہے۔

الشیء فی حکمه (۱) پس اب یہ کہنا بالکل بے غبار ہے کہ تمتع بالدنیا میں کفر ہی کو دخل ہے (۲)، ایمان واسلام دنیا کو تو تمتع بالدنیا میں دخل نہیں بلکہ اسلام کو تمتع بالآخرت (۳) میں دخل ہے حتیٰ کہ وہ دنیا کو بھی بحکم آخرت بنادیتا ہے۔ (واللہ اعلم) رہا یہ سوال کہ یہاں تو حق تعالیٰ نے کفر پر تمتع قلیل کو مرتب فرمایا ہے حالانکہ یہ مشاہدہ ہے کہ کافر کو دنیا زیادہ ملتی ہے اور یہی توجیہ شرطیت کا بھی مقتضا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں متاع قلیل سے مراد دنیا ہے گو وہ دنیا مقدار میں کتنی ہی زیادہ ہو اس کو قلیل ہی کہا جاتا ہے کیونکہ آخرت کے مقابلے میں وہ لاشئ (۴) ہے چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہے: {قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى} (۵) اور قاضی صاحب نے جو تمتع بالدنیا (۶) کو کافر کے ساتھ خاص مانا ہے اس کی تائید دوسری نصوص سے بھی ہوتی ہے۔

خاصیت ایمان

حق تعالیٰ فرماتے ہیں: {اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ} (۷) اور گو یہ آیت شان نزول کے اعتبار سے عورتوں اور مردوں کے ساتھ خاص ہے مگر عموم الفاظ کی وجہ سے ہر خبیث وطیب کو عام ہے جس سے معلوم ہوا کہ خبیث چیزیں خبیثوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ چیزیں پاکیزوں کے لیے ہیں اور دنیا خبیث ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (الدنیا ملعونة وملعون ما فیها الا ذکر الله وما والاہ) (۸) اور حضرات اہل اللہ کا ارشاد ہے:

(۱) اس لیے کہ مقدمہ کسی چیز کا اسی چیز کے حکم میں ہوتا ہے (۲) یہ بات مکمل طور پر ثابت ہوگئی کہ دنیا کا فائدہ کافر ہی کو ہوتا ہے (۳) اسلام کو تو فوائد آخرت میں دخل ہے (۴) بمقابلہ آخرت اسکی کوئی حقیقت نہیں (۵) ''آپ کہہ دیجئے دنیا کا فائدہ تو قلیل ہے اور آخرت اس کے لئے بہترین ہے جو تقویٰ اختیار کرے'' سورۃ النساء: ۷۷ (۶) دنیاوی فائدے کو (۷) ''گندی عورتیں گندے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے اور ستھری عورتیں ستھرے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور ستھرے مرد ستھری عورتوں کے لائق ہوتے ہیں'' سورۃ النور: ۲۶ (۸) سنن ابن ماجہ: ۴۱۱۲، کنز العمال: ۶۰۸۳، کتاب التمہید لابن عبدالبر: ۱/ ۷۔

(الدنیا جیفۃ وطالبوھا کلاب)[۱] اور ایک حدیث میں ہے (لو کانت الدنیا تعدل عنداللّٰہ جناح بعوضۃ ما سقی منہا کافرا اشربتہ ماء)[۲] تو ان نصوص کا مقتضی بھی یہی ہے کہ یہ خبیث دنیا کافروں ہی کے لیے خاص ہونا چاہیے۔ پس دنیا کافروں کے لیے ہے اور کافر دنیا کے لیے ہیں اور آخرت مسلمانوں کے لیے اور مسلمان آخرت کے لیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے بعد محبت دنیا کم ہوجاتی ہے۔ ایمان میں خاصہ ہے کہ وہ محبت دنیا کو سوختہ کردیتا ہے[۳] حدیث میں ہے کہ سیدنا رسول اللہ ﷺ پر ایک یہودی کا قرضہ تھا اس نے آپ پر تقاضا کیا اور سختی کے ساتھ تقاضا کیا یہاں تک کہ حضور ﷺ کو گھر میں بھی نہ جانے دیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو غصہ آیا اور اس کو دھمکانا چاہا تو حضور ﷺ نے سب کو منع کیا اور فرمایا کہ صاحب حق کو تقاضا کا حق ہے غرض رات بھر آپ مسجد میں رہے اور یہودی بھی آپ ﷺ کے پاس رہا صبح کو وہ حضور ﷺ کے اس تحمل وکرم کو دیکھ کر اسلام لے آیا پھر اسلام لاتے ہی اس کی یہ حالت ہوئی کہ یا تو رات کو مال کی اس قدر محبت تھی کہ حضور ﷺ پر تقاضا کرتا اور گھر جانے سے بھی آپ کو روکے رکھا تھا اور یا اب کہتا ہے کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے پاس بہت مال ہے وہ اللہ کے راستہ میں صدقہ ہے جہاں آپ مناسب سمجھیں تقسیم فرمادیں غرض اس کلمہ ایمان میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے حب دنیا کم ہوجاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت — ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براند — در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ وباقی جملہ رفت — مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت[۴]

(۱) "دنیا ایک مردار چیز ہے اور اس کے طلب کرنے والے کتے ہیں" (۲) "اگر دنیا کی قیمت اللہ تعالیٰ کے ہاں مکھی کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتے" مجمع الزوائد: ۱۰/ ۲۸۸ (۳) جلا کر خاک کردیتا ہے (۴) "عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوجاتا ہے تو سوائے محبوب کے سب کو فنا کردیتا ہے لا الہ الا اللہ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں) غیر اللہ کے ہلاک کرنے میں چلاؤ پھر دیکھو لا الہ کے بعد کیا رہ گیا، یعنی اللہ باقی رہ گیا باقی تمام فنا ہوگئے۔ اے عشق عزت وشوکت سوز تجھ پر آفریں ہے کہ سوائے محبوب کے سب کو فنا کردیا"۔

مومن کا خاصہ

اس پر شاید کوئی کہے کہ یہ ایمان کامل کا خاصہ ہوگا کہ حق تعالیٰ کا عشق ہو کر اس سے حب دنیا کم ہوجاتی ہے، مطلق ایمان کا خاصہ ہو نہیں سکتا کیونکہ ہر مسلمان عاشق کہاں ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: {وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ}(۱) اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب مسلمانوں کو اپنا عاشق فرمایا ہے کیونکہ شدت حُب ہی کا نام عشق ہے البتہ عشق کا لفظ چونکہ بھدا سا ہے(۲) اس لیے شریعت میں وارد نہیں ہوا(۳)، ہاں ایک حدیث میں یہ لفظ وارد ہے لیکن اس کی سند میں کلام ہے۔ من عشق فکتم وعف کان لہ اجر شہید(۴) سوممکن ہے کہ راوی نے روایت بالمعنی کی ہو اور بعض جہلاء صوفیہ نے قرآن میں بھی عشق کا لفظ ٹھونسا ہے چنانچہ ایک غالی کا قول ہے کہ حٰمٓ عٓسٓقٓ میں عشق کا ذکر ہے مگر مولویوں سے چھپانے کے لیے اُس کو تہجی کے ساتھ ذکر کیا گیا، کسی نے سوال کیا کہ عشق میں تو شین معجمہ ہے(۵) اور حٰمٓ عٓسٓقٓ میں سین مہملہ ہے تو اس کا جواب اس جاہل نے یہ دیا ہے کہ نعوذ باللہ حضور ﷺ چونکہ اُمّی تھے اس لیے آپ کی زبان سے بڑا شین ادا نہ ہوا آپ نے اس کو سین فرمایا۔ توبہ توبہ اس نامعقول سے کوئی پوچھے کہ پھر سارے قرآن میں کسی جگہ بھی شین معجمہ نہ ہوتا آخر دوسری آیتوں میں آپ نے شین کو کس طرح ادا کیا تھا؟ محدثین نے تو اس روایت کو بھی موضوع کہا ہے جس میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی نسبت یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اذان میں شین کو سین بولتے تھے اور ظاہر ہے کہ وہ تو حبشی تھے جن کے وطن ہی کے نام میں شین موجود ہے وہ تو خوب موٹا شین ادا کرتے ہوں گے جیسا کہ پانی پت قراء تفشّی کرتے ہیں(۶) کہ منہ بھر کے شین کو ادا کرتے ہیں اور جس حدیث کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے جس میں مادہ عشق مذکور ہے گو اس کی سند میں کلام ہو لیکن معنی اس کے صحیح ہیں کہ عشق میں

---

(۱) ''اور جو ایمان والے ہیں سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں'' البقرۃ: ۱۶۵ (۲) براسا ہے (۳) اس لیے شریعت میں مذکور نہیں (۴) تم میں سے جو کسی پر عاشق ہو پھر اس کو پوشیدہ رکھے اور پاکدامن رہے تو اس کو شہید کا اجر ملے گا (۵) معجم وہ حروف کہلاتے ہیں جن پر نقطے ہوں جیسے غ۔ش وغیرہ اور مہملہ وہ حروف کہلاتے ہیں جن پر نقطے نہ ہوں جیسے۔ ح۔س۔ وغیرہ (۶) شین کی صفت ہے کہ منہ بھر کر ادا کیا جائے۔

عفت وکتمان (۱) سے کام لیا جائے تو شہید ہوگا کیونکہ حضور ﷺ نے دق (۲) وغیرہ میں شہادت کی بشارت فرمائی ہے اور عشق تو دق سے بھی زیادہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عشق مجازی مطلوب ہے (۳) کہ لگو اس کے لپٹانے اور اختیار کرنے بلکہ اس کی یہ فضیلت ایسی ہی ہے جیسے غریق وحریق ومدقوق ومطعون (۴) کی فضیلت ہے اس کا تو یہ مطلب نہیں کہ لگو ڈوبنے اور آگ میں کودنے اور بخار چڑھانے جو ایسا کرے گا اُس کو بجائے ثواب کے خودکشی کا عذاب ہوگا جو بہت سخت عذاب ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر اتفاقاً بلا قصد کے کوئی ڈوب جائے یا جل جائے یا کسی کو دِق ہوجائے تو اس کی یہ فضیلت ہے یہی مطلب اس حدیث کا ہے یہ گفتگو تو ضمنی تھی میں اس کو بیان کررہا تھا کہ مولانا نے جو یہ فرمایا ہے ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت هرچه جز معشوق باقی جمله سوخت (۵)

یہ ہر مومن کا خاصہ ہے اسی کو حق تعالیٰ نے {وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ} میں بیان فرمایا ہے کیونکہ حب اور عشق دونوں مرادف ہیں (۶) جنس دونوں کی ایک ہے البتہ عشق میں حد سے تجاوز اور شدت ہوتی ہے وہ اس کی فصل ہے اس فصل کو الگ کرکے دیکھا جائے تو جنس میں حب وعشق ایک ہی ہیں اور نص (۷) میں حب کے ساتھ لفظ اشد بھی ہے بس اب تو شدت حب کا حاصل عشق ہی ہوا۔ معلوم ہوا کہ ہر مومن اللہ کا عاشق ہے اس سے خالی کوئی نہیں مگر یوں کہئے کہ ایک مانع (۸) کی وجہ سے اثر ظاہر نہیں ہوتا ہم لوگوں نے ایک برف کا ٹکڑا اپنے دل پر رکھ لیا ہے (یعنی غفلت) اس برف کو ہٹادو پھر وہ چنگاری اپنا اثر دکھائے گی اور اس برف کے ہٹانے کی یہ صورت ہے کہ اہتمام کرکے غفلت کو دُور کردو فکر اور سوچ کی عادت کرو اور بالخصوص لا الٰہ الا اللہ کا تکرار کرو ایک دن یہ برف لا الٰہ الا اللہ کی گرمی سے پگھل جائے گی۔ اور یہ مضمون اس پر چلا تھا کہ ذکر اللہ

(۱) پاکدامنی اختیار کرے اور چھپائے رکھے (۲) ٹی بی بیماری ہے (۳) کسی عورت یا امرد سے عشق کرنا (۴) غریق ڈوب کر مرنے والا، حریق جل کر مرنے والا، مدقوق ٹی بی کے مرض میں مبتلا شخص، مطعون طاعون کی بیماری میں مبتلاء ہوکر مرے۔ (۵) ''عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو سوائے محبوب کے سب کو فنا کردیتا ہے'' (۶) ہم معنی (۷) قرآن کریم میں (۸) رکاوٹ۔

سے راحت ہوتی ہے اُس پر تفریعاً یہ مضمون بیان کیا گیا تھا کہ ذکراللہ سے غذائے جسمانی کم ہوجاتی اور وہ خود غذا کا کام دیتا ہے۔

مقدار غذائے جسمانی

شیخ ابن القیم فرماتے ہیں اور میں ان کے صوفی ہونے کا قائل ہوں ان کے کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بڑا محقق صوفی ہے اس کے کلام کا رنگ بتلاتا ہے کہ یہ تصوف ومعرفت سے خالی نہیں اور ابن تیمیہ کے صوفی ہونے کا ابن القیم کے قول سے معتقد ہوا ہوں کہ وہ ان کو صوفی مانتے ہیں باقی خود ابن تیمیہ کے کلام سے وہ رنگ ظاہر نہیں ہوتا جو ابن القیم کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے تو وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اس میں شک کرے کہ ذکراللہ سے غذائے جسمانی کم ہوجاتی ہے وہ غبی ہے (اھ) اور واقعی یہ ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس میں بجز غبی (۱) کے کوئی شک نہیں کرسکتا اور جیسے ذکراللہ کی کثرت سے غذائے جسمانی کم ہوجاتی ہے اسی طرح غذائے جسمانی کی کثرت سے غذائے روحانی یعنی ذکراللہ کم ہوجاتا ہے شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

تہی از حکمتی بہ علت آن ۔۔۔ کہ پری از طعام تا بینی (۲)

اس کی جگہ ہی نہیں رہی، اس لیے غذائے جسمانی میں کثرت نہ چاہئے بلکہ توسط کا لحاظ رکھنا چاہئے مگر یہ ضرور ہے کہ سب کا اوسط (۳) ایک نہیں ہے بلکہ ہر شخص کا اوسط مختلف ہے چنانچہ ایک بزرگ کی خانقاہ میں ایک نیا مرید داخل ہوا تو وہ دوسروں سے زیادہ کھاتا تھا نقیب (۴) خانقاہ نے شیخ کو اطلاع دی کہ یہ نو وارد بہت کھاتا ہے اس کو تقلیل غذا (۵) کی نصیحت کی جائے شیخ نے اس کو بلایا کہ بھائی تم ایک وقت میں کتنی روٹیاں کھاتے ہو اس نے مقدار بتلائی جو پندرہ سولہ روٹیاں ہوں گی اور بقیہ اہل خانقاہ پانچ روٹیاں کھاتے تھے، شیخ نے کہا اس طریق میں تقلیل غذا ضروری ہے اور تم بہت کھاتے ہو اپنی خوراک کم کرو اور توسط کا لحاظ رکھو، مرید نے کہا کہ حضرت کیا سب کا اوسط برابر ہے یا ہر ایک کا اوسط جدا ہے، فرمایا نہیں بلکہ ہر ایک کا اوسط جدا ہے، مرید نے کہا

(۱) کم فہم (۲) ''یعنی جب تم روٹی سے ناک تک ٹھسے ہوئے ہو تو اب تمہارے اندر ذکر اللہ کیونکر سمائے'' (۳) درمیانہ درجہ (۴) خانقاہ کے نگران نے (۵) کم کھانے کی۔

حضرت تو پہلے آپ نے مجھ سے تو یہ پوچھا ہوتا کہ تیری اصلی خوراک کیا ہے، میری اصلی خوراک چالیس پچاس روٹیوں کی ہے اس کے لحاظ سے یہ پندرہ سولہ تو اوسط سے بھی کم ہیں شیخ محقق تھے فوراً اپنی غلطی کو مان گئے اور خانقاہ والوں سے فرمایا کہ بھائی اس کو ملامت نہ کرو واقعی جتنا یہ کھاتا ہے وہ اس کے اوسط سے بھی کم ہے۔

اوسط کی حقیقت

سب کا اوسط ایک نہ ہونے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ وہ یہ کہ ایک چوہے اور اونٹ کی دوستی ہوگئی تھی، دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے ایک دفعہ راستے میں ندی آئی اونٹ تو بے تکلف اندر گھس گیا چوہا کنارہ پر رہ گیا اونٹ نے کہا پیچھے کیوں رہ گیا کہا میں ڈوب جاؤں گا تو اونٹ کہتا ہے کہ نہیں ڈوبنے کی کوئی وجہ نہیں ہے پانی تو گھٹنوں گھٹنوں ہے چوہے نے کہا حضور آپ کے گھٹنے تک تو میرا سارا خاندان ڈوب جائے گا تو جو شخص سب کو اپنے اوپر قیاس کرے وہ اس اونٹ کے مشابہ ہے جس نے چوہے کو اپنے اوپر قیاس کیا تھا، میرٹھ میں ہمارے ایک دوست ہیں وہ جب قصد کرتے ہیں تو بہت کھا جاتے ہیں اور کمال یہ کہ نہ قبض ہو نہ اسہال (۱) بلکہ اُس حال میں ہی رہتے ہیں جو پہلے تھا ایک دفعہ ایک خوانچہ والے (۲) کی مصیبت آگئی، انہوں نے اس سے کہا کہ مٹھائی سے ہمارا پیٹ بھر دو اور بتلادو کہ پیٹ بھرائی کا کیا لوگے، وہ یہ سمجھا کہ بہت سے بہت سیر بھر کھالیں گے اس نے دس بارہ آنے بتلائے، یہ راضی ہوگئے اور کھانے جو بیٹھے تو سیروں کھا گئے آخر خوانچہ والا رونے لگا کہ تم مجھ سے اپنے دام واپس لے لو میں اپنی شرط سے باز آیا، اب ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا اوسط دوسروں کے برابر نہیں ہوسکتا، غرض اوسط ہر ایک کا الگ ہے اس کی رعایت چاہئے اور اوسط سے تجاوز کرنا اور زیادہ کھانا برا ہے۔

تشبہ بالملئکہ

اسی طرح اوسط سے کم کھانا بھی مضر ہے یہ میں نے اس واسطے کہہ دیا کہ یہاں بعض مبتدی سلوک بھی موجود ہیں جو محقق نہیں ہیں کہیں وہ کم کھانے کی فضیلت سن کر غذا

(۱) نہ قبض ہو نہ دست آئیں (۲) ٹھیلے والے کی مصیبت آگئی۔

کو اوسط سے بھی کم نہ کردیں چنانچہ بعض مبتدی ایسا کرچکے ہیں اور اس سے ضرر(۱) اٹھا چکے ہیں ایک ضرر تو جسمانی ہے کہ غذا بہت کم کرنے سے ضعف لاحق ہوجاتا ہے اور ایک ضرر مقصود سلوک کا ہے وہ یہ کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ تشبہ بالملئکۃ حاصل کرے اور تشبہ بالملئکہ اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو نہ شبع سے بدمست(۲) ہو نہ جوع سے(۳) پریشان ہو بلکہ معتدل حالت میں رہ کر طمانیت وجمعیت قلب سے متصف ہو(۴) پس بھوکا رہنا کمال نہیں بلکہ فی نفسہ نقص ہے(۵) مگر بعض دفعہ ضرورت علاج کے لیے تجویز کیا جاتا ہے جیسے دَست آنا کمال نہیں مگر بعض دفعہ کسی ضرورت سے مسہل دیا جاتا ہے(۶) اور بعض بیماروں کو فاقہ کرایا جاتا ہے مگر فی نفسہ مطلوب نہیں جیسے سفرِ حج میں ہمارے ساتھ ایک رفیق حج ایسا ہی سمجھتے تھے وہ کبھی تو اتنا کھاتے کہ کئی آدمیوں کی خوراک کھا جاتے اور کبھی ایسا فاقہ کرتے تھے کہ کئی دن تک کچھ نہ کھاتے اور یہ کہا کرتے تھے کہ مجاہدہ اکلًا وجوعًا(۷) دونوں طرح ہونا چاہئے کیونکہ مجاہدہ سے مقصود نفس کو پریشان کرنا ہے تو زیادہ کھا کر بھی اسے پریشان کرنا چاہئے اور فاقہ کرکے بھی مگر بندہ خدا دونوں حالتوں میں تشبہ بالملئکہ(۸) سے محروم تھا کبھی شبع سے بدمست(۹) ہوتا اور کبھی فاقہ سے پریشان ہوتا تو یہ کمال نہ تھا بلکہ نقص تھا وہ بیچارہ ایسے شاہ صاحب کا مرید تھا جہاں حضرت علیؓ کی حقیقی وراثت یعنی تعلیم وتربیت کچھ نہ تھی اس لیے ان کے مریدوں کے اندر ایسی ہی بے قاعدہ باتیں ہیں بلکہ بہت سے شرکیات(۱۰) میں مبتلا ہیں کہ پیر کے نام کا وظیفہ پڑھتے ہیں اور اپنی تحریرات کے اول میں بھی اُن کا نام لکھتے ہیں اور افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ کچھ دنوں سے ہماری جماعت کے اندر بھی ایک شائبہ شرک کا آچلا ہے کہ خطوط میں بامداد اللہ اور ہوالرشید لکھتے ہیں اگر اس سے حضرت حاجی صاحب اور حضرت مولانا گنگوہی کے نام سے استعانت وتیمن(۱۱) مقصود نہیں تو اس کی کیا وجہ کہ بعون اللہ اور ہواللہ کو چھوڑ کر امداد اور رشید کا لفظ اختیار کیا گیا، کیا اللہ کا نام رشید ہی رہ گیا اور بھی تو

(۱) نقصان (۲) پیٹ بھرا ہوا ہونے کی وجہ سے آپے سے باہر ہوجائے (۳) بھوک سے پریشان (۴) بلکہ درمیانی حالت پر رہے کہ دل میں یکسوئی ہو (۵) عیب (۶) دست آور دوا دی جاتی ہے (۷) مجاہدہ زیادہ کھا کر اور بھوکے رہ کر دونوں طرح ہوتا ہے (۸) مشابہت ملائکہ سے محروم تھا (۹) کبھی پیٹ بھرا ہونے کی وجہ سے مستی سوجھتی (۱۰) مشرکانہ اعمال (۱۱) مدد وبرکت حاصل کرنا مقصود نہیں۔

بہت سے اسماء ہیں مگر ان میں پیر کے نام کی طرف کیونکر اشارہ ہوتا بس یہی شائبہ شرک ہے گو شرک نہ ہو اور اسی کے قریب ایک مرض یہ ہے کہ ہماری جماعت کے لوگ اپنے نام کے ساتھ رشیدی، قاسمی، خلیلی، محمودی لکھنے لگے اور بعض کوڑی (۱) ہو کر اپنے کو اشرفی لکھتے ہیں اس میں شائبہ شرک تو نہیں مگر تحزب ہے (۲) اور پارٹی بندی ہے اور حنفی شافعی لکھنے میں جو حکمت ہے وہ یہاں نہیں ہوسکتی کیونکہ وہاں تو اہل زیغ یعنی مدعیان اجتہاد سے احتراز مقصود ہے یہاں کس سے احتراز مقصود ہے کیا اس جماعت میں بھی تمہارے نزدیک کوئی صاحب زیغ ہے (۳) جس سے امتیاز کا قصد کیا جاتا ہے البتہ اس کا مضائقہ نہ تھا کہ یہ سب کے سب اپنے کو امدادی لکھا کریں تو اس میں یہ حکمت ہوسکتی ہے کہ سلسلہ اہل بدعت سے احتراز مقصود ہے کیونکہ اس زمانہ میں صوفیہ کے جس قدر سلاسل ہیں قریب قریب سب بدعات میں مبتلا ہیں۔ صرف حاجی صاحب (۴) کا سلسلہ ہی ایسا ہے جو اتباع سنت کے ساتھ ممتاز ہے یہ گفتگو شیخ ناقص کے اُس مرید کے قصہ پر چلی تھی جو سفر حج میں ہمارا رفیق تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس طرح زیادہ کھانے سے تشبہ بالملئکہ فوت ہوتا ہے یوں ہی کم کھانے سے بھی یہ تشبہ زائل ہوجاتا ہے پس جس طرح بہت کھانا مطلوب نہیں کم کھانا بھی مطلوب نہیں بلکہ اصل مقصود جمعیت قلب ہے (۵) فقہاء نے اس کو سمجھا ہے اور فقہاء بھی صوفی ہیں یہ مزاج شناس ہیں جناب رسالت مآب ﷺ کے، اس لیے فقہ وحدیث سب تصوف ہی ہے شریعت وطریقت ایک ہے، ایک ہی چیز کے چند نام ہیں۔

شعراء کا ذوق

صوفی اگر واقعی صوفی ہوگا تو اس کو فقہ وحدیث میں بھی تصوف نظر آئے گا اور

---

(۱) ایک پیسہ سے بھی کم سکہ ہوتا تھا جس کی تفصیل یہ ہے ایک پیسے کے دو دھیلے اور تین پائی ہوتی تھی ایک پائی کے چھ دام ایک دام کی چھ دمڑیاں ایک دمڑی کی آٹھ کوڑیاں ہوتی تھیں، اور ایک کوڑی کا بھی سودا مل جاتا تھا۔ معلوم ہوا سب سے چھوٹا سکہ کوڑی تھا جبکہ بڑا سکہ اشرفی تھا جو کہ سونے کی ہوتی تھی جو تقریبا سوا چار گرام سونے کی ہوتی تھی۔ حضرت تھانوی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو لوگ اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے اپنے کو اشرفی لکھتے ہیں حقیقت ان کی کوڑی جیسی ہوتی ہے (۲) گروہ بندی (۳) کج رو ہے (۴) اور حاجی صاحب کے خدام میں جو بعض مبتدئین تھے اُن سے سلسلہ ہی نہیں چلا یہ بھی اُس کی دلیل ہے کہ وہ حاجی صاحب کے طریق پر نہ تھے ورنہ ضرور فیض چلتا (۵) دل جمعی۔

وہ یوں کہے گا

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش — من انداز قدت رامی شناسم(۱)

اور ایک نسخہ یہ ہے ؎

بہر رنگے ترا من می شناسم(۲)

اور ایک نسخہ یہ ہے ؎

من از رفتارِ پایت می شناسم(۳)

ہر شاعر نے اپنے مذاق کے موافق جو اچھا لگا کہہ دیا اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ آشفتہ ایک شاعر تھا اس نے ایک غزل لکھی جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

حال آشفتہ چہ دانی بے خبر — در خیالِ زلف عنبر بوئے تو(۴)

اور استاد کے سامنے اصلاح کے لیے پیش کی استاد نے یوں اصلاح دی ؎

حال آشفتہ پریشان تر شدہ(۵)

غالب کو اطلاع ہوئی تو کہا کہ استاد ''صاحب قال'' ہے اور شاگرد ''صاحب حال'' ہے۔ واقعی ؎

حال آشفتہ پریشان تر شدہ(۶)

میں صنعت تو بڑھ گئی کہ آشفتہ اور پریشانی میں خاص مناسبت ہے مگر چہ دانی بے خبر میں جو بے ساختگی اور بے چارگی ہے وہ پریشان تر شدہ میں کہاں، اسی طرح کسی نے صنعت کا لحاظ کر کے ؎

من انداز قدت رامی شناسم(۷)

کہا اور کسی نے بے ساختگی سے ؎

بہر رنگے ترا من می شناسم(۸)

---

(۱) ''جس رنگ کا کپڑا پہنے گا قد کے انداز سے تجھ کو پہچان لوں گا'' (۲) ''ہر رنگ سے میں تجھ کو پہچان لیتا ہوں'' (۳) ''پاؤں کی رفتار سے میں تجھ کو پہچان لیتا ہوں'' (۴) ''تیرے زلف و عنبر میں آشفتہ کا جو حال ہے بے خبر تو اس کو کیا جان سکتا ہے'' (۵) ''آشفتہ کا حال زیادہ پریشان ہو گیا'' (۶) ''آشفتہ کا حال زیادہ پریشان ہو گیا'' (۷) ''قد کے انداز سے میں تجھ کو پہچان لیتا ہوں'' (۸) ہر رنگ سے میں تجھ کو پہچان لیتا ہوں۔

کہا یہ تو ایک لطیفہ تھا مقصود یہ ہے کہ شریعت اور طریقت دونوں ایک ہی چیز کے ایوان ہیں ۔

عباراتنا شتی وحسنک واحد وکل الی ذاک الجمال یشیر

ہمارے عنوانات مختلف ہیں مگر مضمون صرف ایک حسن ہے اور ہر عنوان اس خوبصورتی کی طرف اشارہ ہے۔

چائے میں برف

فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو تیز بھوک لگ رہی ہو اور کھانا سامنے رکھا ہو، اِدھر جماعت شروع ہوگئی ہو تو پہلے کھانا کھالے پھر نماز پڑھے یہ مسئلہ تو حدیث میں صراحتاً مذکور ہے اذا حضر العَشاء والعِشاء فابدؤا بالعَشاء(۱) جس سے معلوم ہوا کہ کم کھانا مطلوب نہیں بلکہ جمعیت قلب (۲) مطلوب ہے اسی لئے تو حضور ﷺ نے اس حالت میں کھانے کو نماز سے مقدم فرمایا پھر فقہاء نے اس پر ایک دوسرے مسئلہ کی تصریح کی وہ یہ کہ اگر کسی کو بھوک زیادہ نہ ہو مگر کھانا ٹھنڈا ہو جانے کا اندیشہ ہے اور ٹھنڈا ہونے سے اس کی لذت جاتی رہے گی جب بھی اجازت ہے کہ کھانا پہلے کھالے اور نماز کو موخر کردے کیونکہ بعض کھانے ایسے ہیں جن کی لذت گرم ہی رہنے تک ہے مثلاً چائے گرم ہی اچھی لگتی ہے اور اہل ذوق کہتے ہیں کہ پلاؤ گرم ہی اچھا ہوتا ہے اور زردہ ٹھنڈا اچھا ہوتا ہے اور ہمارا ذوق تو سب ہی سے نرالا ہے ہم تو اُس دیہاتی پیر کے مشابہ ہیں جس سے مرید نے کہا کہ حضور میں نے میٹھے چاول پکائے ہیں گھی سے کھائیں گے یا دودھ سے تو پیر نے کہا بھائی ہم بے سوادوں کا کیا سواد (۳) ہم تو گھی لگا کر اوپر سے دودھ ڈال لیں گے۔ (سبحان اللہ! دونوں نعمتوں کو منگوا کر بھی بے سواد ہی رہے) اور آج کل جنٹلمینوں میں یہ نیا رواج نکلا ہے کہ چائے میں برف ڈال کر پیتے ہیں یہ تو محض یورپ کے مقلد ہیں اگر وہ کسی وقت ناک کٹوانے لگیں تو یہ ناک بھی اڑا دیں گے، اس فیشن کی اصل یہ ہے کہ کوئی انگریز بڑے درجہ کا ریل سے اسٹیشن پر اتر کر ہوٹل میں کھانا کھانے گیا پھر چائے سامنے لائی گئی جو بہت گرم تھی ٹھہر ٹھہر کر پینے میں گاڑی چھوٹ جانے کا اندیشہ تھا اس نے اس مصلحت سے

(۱) ”جب کھانا سامنے آئے اور عشا کا وقت ہو جائے تو پہلے کھانا کھاؤ“ (۲) دل جمعی (۳) ہم بے ذوق لوگوں کو ذائقہ سے کیا لینا۔

برف ڈال لیا تھا کہ ٹھنڈا کرنے میں دیر نہ لگے کسی ہندوستانی نے صاحب بہادر کا یہ فعل دیکھ لیا وہ سمجھے کہ یہ بھی فیشن ہے حالانکہ ایک خاص وجہ سے اس نے ایسا کیا تھا۔

کھانے کی رعایت

فقہاء نے کھانے کی یہاں تک رعایت کی ہے کہ اگر ٹھنڈا ہونے سے اس کی لذت زائل ہوجانے کا اندیشہ ہو جب بھی نماز کو مؤخر کردینا جائز ہے اور منشا اس کا وہی ہے کہ اس حالت میں نماز پڑھنے سے جمعیت قلب فوت ہوگی(۱) بار بار یہ خیال آئے گا کہ نماز جلدی پڑھو تاکہ کھانا ٹھنڈا نہ ہوجائے، معلوم ہوا کہ اصل مطلوب جمعیت قلب ہے کہ اسی سے تشبہ بالملئکہ حاصل ہوتا ہے کم کھانا مطلوب نہیں اور پہلے صوفیہ سے جو تقلیل غذا کے واقعات منقول ہیں آج کل ان پر عمل نہیں ہوسکتا کیونکہ ان حضرات میں قوت زیادہ تھی ان کو غذا بہت کم کرنے سے بھی جمعیت قلب فوت نہ ہوتی تھی ان کی قوت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اُن سے بعضے ایسے اشتغال منقول ہیں جو آج کل کوئی کرے تو مرہی جائے چنانچہ ایک شغل صلوٰۃ معکوس کا ہے اور اُس کو اصطلاحًا صلوٰۃ کہہ دیا گیا ہے ورنہ وہ نماز نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اُلٹا لٹک کر شغل کرتے ہیں، بابا فرید گنج شکر سے یہ مراقبہ منقول ہے کہ کسی کتاب میں تو دیکھا نہیں مگر مشہور ہے کہ وہ رات کو ایک کنویں میں الٹا لٹک کر شغل کرتے تھے اور نماز کے وقت مؤذن اُن کو نکال لیا کرتا تھا، آج کل ایک جاہل شیخ نے اپنے ایک مرید کو یہ شغل تعلیم کیا اس نے شکایت کی کہ مجھے تو اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے جو برداشت سے باہر ہے کہا کچھ پرواہ نہیں مجاہدہ تو ہے ہی تکلیف کے لیے انجام یہ ہوا کہ ایک دن غریب کی جان نکل گئی مگر شیخ جاہل کو کچھ بھی پرواہ نہیں ہوئی سمجھ لیا ہوگا کہ شہید ہوا اور واقعی جب کافر کا مارا شہید ہے تو تیرا مارا ہوا کیونکر شہید نہ ہوگا وہ تو شہید ہی ہوا مگر تُو جہنمی ہوگیا۔ جیسے ایک جاہل طبیب نے کسی مریض کو مسہل دیا تھا(۲) کہ اس کو دست بہت آئے طبیب کو اطلاع دی گئی کہ دست بہت آرہے ہیں بند کرنے کی تدبیر کرنا چاہئے کہا آنے دو مادہ نکل رہا ہے، دوسرے دن پھر کہا گیا کہ اب بھی دست بند نہیں ہوئے کہا

(۱) دل جمعی نہ رہے گی (۲) دست آور دوادی۔

کچھ پرواہ نہیں اُس میں مادہ بہت ہے نکلنے دو آخر تیسرے دن وہ مرگیا تو طبیب کہتا ہے اللہ رے مادہ نکل کر تو یہ نتیجہ ہوا، اندر رہتا تو نہ معلوم کیا کرتا کوئی اس احمق سے پوچھے کہ موت سے زیادہ کیا کرتا ہاں شاید طبیب کو یہ احتمال ہو کہ اندر رہ کر دوسروں کو بھی ماردیتا جیسا کہ ڈاکٹر بعض امراض کو متعدی مانتے ہیں غرض پہلے بزرگوں پر اپنے کو قیاس کر کے تم ان کی طرح غذا کم کرنے کی تدبیر نہ کرو ان میں قوت بہت زیادہ تھی تم کمزور ہو تم کو زیادہ تقلیل سے تکلیف ہوگی جس سے جمعیت قلب فوت ہو جائے گی، شاید اس پر کسی کو یہ شبہ ہو کہ ہم کو تو جمعیت قلب نہ کھانا کم کرنے سے حاصل ہے، نہ زیادہ سے نہ اوسط سے۔

جمعیت قلب

تو سمجھ لو کہ جمعیت قلب وہ مطلوب ہے جس میں اپنی طرف سے اسباب مشوشہ(۱) کو اختیار نہ کیا جائے پھر اگر جمعیت حاصل نہ ہو تو یہ معذور ہے اور جب کھانا اوسط مقدار میں کھایا جائے گا تو یہ بات ضرور حاصل ہوگی اور زیادہ کھانے اور بہت کم کھانے میں یہ بات حاصل نہیں ہوئی بلکہ اس نے خود اسباب مشوشہ(۲) کو جمع کیا اور جمعیت قلب بہ ایں معنی مطلوب نہیں کہ بلا قصد بھی تشویش نہ ہو میرا تجربہ ہے اور میں اس پر قسم کھا سکتا ہوں کہ جو تشویش قلب اختیار سے ہو وہی مضر ہے(۳) کیونکہ یہ شخص خود بخود پریشانی کو خریدتا ہے اور اگر بلا قصد تشویش ہو وہ کچھ مضر نہیں مثلاً ایک شخص صاحب عیال ہے(۴) اس وجہ سے دنیا میں مشغول ہے اور اس کو کسی وقت یکسوئی حاصل نہیں ہوتی نماز اور ذکر میں بلا قصد و اختیار وساوس مشوشہ(۵) آتے رہتے ہیں تو یہ کچھ مضر نہیں اور جس کو پریشانی کچھ نہیں مگر وہ خواہ مخواہ بالقصد مشوشات(۶) کو جمع کرتا ہے، یہ مضر ہے پس جن مشتغلین بالدنیا(۷) کو توسط فی الغذا سے یکسوئی حاصل نہیں ہوتی وہ ہرگز پریشان نہ ہوں کیونکہ اس کے بعد جو تشویش بلا قصد ہوگی وہ ذرا مضر نہیں کہ وہ محض وسوسہ غیر اختیاری ہوگا جو وسوسہ و حدیث النفس غیر اختیاری ہو وہ مضر نہیں البتہ جو بقصد اور بلا ضرورت ہو وہ مضر ہوتا ہے اور یہ بات کہ ضروری مضر نہیں اور غیر ضروری مضر ہے کچھ حدیث النفس ہی

(۱) پریشانی میں مبتلا کرنے والے اسباب اختیار نہ کرے (۲) پریشان کن اسباب (۳) نقصان دہ (۴) بچے زیادہ ہیں (۵) پریشان کن وسوسے (۶) ارادۃً پریشان کن باتیں سوچتا ہے (۷) دنیا میں مشغول لوگ۔

کے ساتھ خاص نہیں بلکہ حدیث اللسان (۱) یعنی کلام لسانی میں بھی یہی قاعدہ ہے کہ ہر چند کہ تقلیل کلام ضروری ہے اور تکثیر کلام مضر ہے مگر وہی تکثیر مضر ہے جو بے ضرورت ہو چنانچہ بلاضرورت ایک کلمہ بھی زبان سے نکالنا قلب کا ستیاناس کر دیتا ہے مگر قلوب پر چونکہ ظلمت محیط ہے (۲) اس لیے بہت لوگوں کو اس مضرت کا احساس نہیں ہوتا اگر قلب میں نور ہو تو معلوم ہوگا کہ اس ایک غیر ضروری کلمہ سے قلب کا کیا حال ہو گیا لیکن بضرورت تکثیر ہو تو کچھ بھی مضر نہیں مثلاً ایک شخص پہرہ دینے پر نوکر ہے وہ رات بھر جاگو جاگو کہتا ہے اس سے نور قلب میں کچھ بھی کمی نہ آئے گی، اسی طرح دکاندار خریداروں سے تجارت کی ضرورت سے گھنٹوں باتیں کرتا ہے تو جب تک ضرورت کی وجہ سے باتیں کر رہا ہے اس کے قلب کو اس سے کچھ ضرر نہ ہوگا خواہ کتنی ہی دیر لگ جائے اسی طرح تحریر میں بھی جب تک ضرورت کا مضمون لکھا جائے کچھ ضرر نہ ہوگا اور بے ضرورت ایک جملہ بھی لکھا گیا تو قلب کا ناس ہو جائے گا یہ ذرا سی بات ہے اس کو غور سے سنو کیونکہ بہت لوگ کلام فضول کو تو مضر سمجھتے ہیں مگر تحریر کو مطلقاً مضر نہیں سمجھتے گو فضول ہی ہو وہ اس کو کلام ہی نہیں سمجھتے حالانکہ یہ بھی ایک نوع ہے کلام کی۔

کلام کی اقسام

ان کا تحریر کو کلام نہ سمجھنا ایسا ہے جیسا ایک طالب علم نے نماز میں قم (۳) کہا تھا اور وہ کلام صرف اردو جملہ کو سمجھتا تھا اور عربی کو تلاوت سمجھتا تھا جیسے ایک گنوار نے مزاح میں عربی لغات کو قرآن خوانی سے تعبیر کیا تھا قصہ یہ ہوا کہ لکھنؤ میں ایک رئیس کے پاس جس کو لغات بولنے کا شوق تھا گاؤں کے زمیندار آئے تو رئیس نے ان سے پوچھا کہ امسال تمہارے کشت زار گندم پر تقاطر امطار ہوا یا نہیں (۴) تو ایک گنوار نے کہا کہ چلو میاں یہ تو ابھی کران (قرآن) پڑھ رہے ہیں جب آدمیوں کی بولی بولیں گے اس وقت آئیں گے ان رئیس کا نام تفضل حسین خان تھا یہ عامل بھی تھے گو بزرگ نہ تھے چنانچہ وہ عمل ہی کے ذریعے شیر کو مسخر کر لیتے تھے ایک دفعہ شیرنی ان کے گھر میں سو رہی تھی جس پر کپڑا ڈال رکھا تھا اسی وقت ایک دوست ملنے آگئے انہوں نے شیرنی پر کپڑا پڑا ہوا دیکھ کر یہ

(۱) باتیں کرنے میں (۲) دل کو گناہوں کی سیاہی نے گھیرا ہوا ہے اس لیے اس نقصان کا اندازہ نہیں ہوتا (۳) کھڑے ہو جاؤ (۴) اس سال آپ کے گندم کے کھیت میں بارش ہوئی کہ نہیں۔

سمجھا کہ شاید کسی عورت کو بھگا کر لائے ہیں جس کو چادر سے چھپا رکھا ہے وہ کہنے لگے کہ آج تو چوری پکڑ لی اور چادر کو اُٹھانا چاہا یہ کہنے لگے کہ خبردار کپڑا نہ اُٹھانا دوست نے کہا کہ ایسی کہاں کی حور یا پری ہے جو تاب نہ رہے گی یہ کہہ کر کپڑا اُٹھا دیا۔

کپڑے کا اُٹھانا تھا اور شیرنی نے غرا کر ان کی طرف نگاہ کی بس یہ صورت دیکھتے ہی دھڑام سے بے ہوش ہو کر گر پڑے تو جیسے گاؤں والوں نے اس رئیس کی باتوں کو کلام سے خارج کر کے تلاوت قرآن کہا تھا اسی طرح آج کل بہت لوگ تحریر کو کلام سے خارج سمجھتے ہیں اور اس کی مضرت کے معتقد نہیں وہ اس کو کلام ہی نہیں سمجھتے حالانکہ اگر قلب میں ذرا بھی سلامتی ہو تو معلوم ہو کہ جیسے ایک کلام لفظی ہے ایسے ہی ایک کلام تحریری بھی ہے اور ایک کلام نفسی بھی ہے اور ہر ایک میں بلا ضرورت ایک جملہ سے بھی قلب کا ناس ہو جاتا ہے اور سب سے زیادہ ضرر غیر ضروری کلام نفسی سے ہوتا ہے کیونکہ وہ قلب کے زیادہ قریب ہے مگر بہت لوگ اس کو بھی کلام نہیں سمجھتے اور بلا ضرورت حدیث النفس میں مشغول رہتے ہیں جس سے دل سیاہ و برباد ہو جاتا ہے بہرحال کلام کی تین قسمیں ہیں ایک کلام نفسی ہے ایک لفظی ہے ایک تحریر ہے اور کلام تحریری میں جیسے لکھنا داخل ہے ایسے ہی تحریر کا مطالعہ بھی داخل ہے لکھے ہوئے مضمون کا دیکھنا بھی تکلم تحریری ہے اس لیے ہر کتاب کا مطالعہ بھی جائز نہیں بلکہ ضروری اور مفید کا مطالعہ ہی جائز ہے اور جو تحریر مضر ہو جیسے ناول وغیرہ ان کا دیکھنا جائز نہیں اور جو مضر نہ ہو مگر بلا ضرورت ہو اس سے گناہ تو نہ ہو گا مگر قلب پر اس کا بھی بُرا اثر پڑے گا غرض کلام کی یہ تین قسمیں ہیں اور ہر ایک میں ضرورت کا درجہ مضر نہیں اور بلا ضرورت ایک جملہ کا تلفظ یا کسی بات کا سوچنا یا لکھنا مضر ہے، چنانچہ بعض لوگ کلام کو خوشنما بنانے میں ''سجع''(۱) وغیرہ کا تکلف کرتے ہیں چونکہ یہ بلا ضرورت ہے اس لیے قلب کو اس سے ضرر ہوتا ہے اور اسی کی تعلیم کے واسطے قرآن میں سجع کی رعایت نہیں کی گئی بعض سورتوں میں دور تک فواصل مسجع چلے گئے ہیں مگر آگے چل کر سجع کو توڑ دیا گیا حالانکہ حق تعالیٰ قادر مطلق ہیں اُن کو سجع میں کیا تکلف ہوتا اگر وہ چاہتے تو سارے قرآن کو مسجع ہی نازل فرما دیتے مگر باوجود قدرت کے ایسا نہیں کیا گیا تو اس میں

(۱) قافیہ بندی۔

ہم کو تنبیہ ہے عدم تکلف کی کہ دیکھو جب ہم باوجود قدرت کے سجع کی رعایت نہیں کرتے حالانکہ ہم کو اس میں تکلف بھی نہیں کرنا پڑتا تو تم کو بھی سجع کی رعایت نہ کرنا چاہئے کیونکہ تم کو تکلف کرنا پڑے گا اور بے ضرورت چیز کے لیے تکلف کرنا تم کو مضر ہے(۱)۔

عملی تعلیم

اس تنبیہ کی نظیر وہ ہے جس کو ہمارے علماء نے {خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ}(۲) میں بھی حکمت بیان کی ہے کہ اس میں حق تعالیٰ نے ہم کو تنبیہ کی ہے کہ کام میں عجلت نہ کرنا چاہئے بلکہ سکون واطمینان سے کرنا چاہئے دیکھو ہم نے باوجودیکہ ہم ایک کلمہ "کُنْ" سے سب کچھ پیدا کرسکتے تھے پھر بھی زمین وآسمان کو چھ دن میں بنایا ہے پھر تم باوجود عجز کے عجلت کیوں کرتے ہو تو جیسا علماء نے حق تعالیٰ کے اس فعل کو تعلیم عملی پر محمول کیا ہے اسی طرح میرے نزدیک قرآن میں سجع کی رعایت نہ ہونا بھی عملی تعلیم ہے پس یہ شریعت کی بہت بڑی تعلیم ہے کہ بے ضرورت اور بے فائدہ باتوں میں نہ پڑنا چاہئے۔ حدیث میں ہے: من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه (۳) مگر آج کل مسلمانوں نے اس تعلیم کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے اکثر لوگ فضول باتوں کے درپے ہیں اور ضروریات سے غافل ہیں۔ میرے پاس ایسے فضول سوالات بہت آتے ہیں جن کو اعتقاد یا عمل میں کچھ بھی دخل نہیں ہوتا میں ایسے سوالات کا جواب ہی نہیں دیتا بلکہ لکھ دیتا ہوں کہ یہ سوال فضول ہے اس پر بعض لوگ خفا بھی ہوتے ہیں مگر بے رنج کے گنج نہیں (۴) ملا کرتا اس وقت تو اُن کو میرا جواب ناگوار ہوتا ہے لیکن جب ان پر حقیقت منکشف ہوگی (۵) اس وقت اس جواب کی قدر ہوگی اور اس میں عوام کی خطا تو ہے ہی مگر اُن سے زیادہ بعض علماء کی بھی خطا ہے کہ ایسے فضول سوال کرنے والوں کو منہ لگاتے ہیں اور ان کو غلطی پر متنبہ نہیں کرتے پھر جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ زیادہ علماء تو اس رنگ کے ہیں جو ہر سوال کا جواب دے دیتے ہیں اب وہ شخص اُن کو اوپرا معلوم ہوتا ہے (۶)

(۱) نقصان دہ ہے (۲) سورۃ الاعراف: ۴/ ۶۴ (۳) "اسلام کی خوبی یہ ہے کہ فضول کام ترک کردے" الکامل لابن عدی: ۳/ ۷، ۹۰، مسند احمد: ۱/ ۲۰، کنزالعمال: ۳/ ۸۲۹۱ (۴) بلا مشقت خزانہ نہیں ملتا (۵) حقیقت آشکار ہوگی (۶) برا معلوم ہوتا ہے۔

جو بعض سوالوں کو فضول بتلا کر رد کر دیتا ہے چنانچہ یہ بات اُن کی زبان پر بھی آتی ہے کہ ہم نے یہی سوال فلاں مولوی صاحب سے بھی کیا تھا انہوں نے تو اس کو فضول نہیں بتلایا بلکہ جواب دے دیا تھا گو اُس سے ہماری تسلی نہیں ہوئی اس طرح علماء نے جاہلوں کا دماغ بگاڑ دیا ہے کہ اب اُن کو یہی معلوم نہیں کہ ہمارے بعض سوالات فضول ولا یعنی بھی ہوتے ہیں بلکہ وہ ہر سوال کو ضروری سمجھتے ہیں۔

قرأت اور موسیقی

اس عدم تنبیہ کی نظیر میں مجھے ایک قصہ یاد آیا میں ایک دفعہ بریلی تھا وہاں ایک خان صاحب ایک انسپکٹر صفائی کے ہمراہ مجھے ملنے آئے، انسپکٹر نے ان کی تعریف کی کہ یہ موسیقی میں بہت ماہر ہیں اور یہ قرآن بھی بہت اچھا! پڑھتے ہیں مجھے معلوم تھا کہ گویا آدمی قرآن کیا پڑھے گا مگر یہ خیال ہوا قرآن بھی اگر نہ سنا تو وہابیت کی اور رجسٹری ہوجائے گی اس لیے میرے منہ سے نکل گیا کہ بہت اچھا، قرآن سن لوں گا پس خان صاحب تیار ہوگئے اور انہوں نے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کو موسیقی کے قاعدہ سے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اس طرح پڑھا کہ میں نے ان کی اعوذ باللہ سن کر ہی کہا نعوذ باللہ (۱)، انہوں نے اول تو اعوذ کے واؤ کو بہت لمبا کھینچا اور آواز کو بھی بے حد بلند کیا پھر آواز کو اتارتے ہوئے بے حد پست کر کے باللہ کو ادا کیا، میں نے اعوذ باللہ سن کر ہی اُن کو روک دیا کہ بس آگے قرآن کو بھی اسی طرز سے پڑھیں گے میں سننا نہیں چاہتا کیونکہ اس طرح قرآن پڑھنا بھی حرام اور اس کا سننا بھی حرام، خان صاحب بگڑ گئے اور کہنے لگے واہ صاحب میں نے بہت سے علماء کو قرآن سنایا ہے کسی نے بھی مجھ پر اعتراض نہیں کیا، میں نے کہا خان صاحب میں نے اسی لیے متنبہ کیا ہے کہ آپ مجھ کو اُس فہرست میں شمار نہ فرماویں اُن علماء ہی نے آپ کو یہ جرأت دلائی ہے کہ آج آپ میرے سامنے بھی پڑھنے کو تیار ہوگئے اگر ان میں سے کوئی آپ کی خیر خواہی کرتا اور آپ کے عیب پر متنبہ کر دیتا تو آج آپ کو یہ نوبت نہ آتی اس پر خان صاحب تیز ہو کر کہنے لگے کہ اچھا پھر آپ ہی بتلائے کس طرح پڑھنا چاہیے میں نے کہا یہ تو جب کہیے کہ میں اچھا پڑھنے کا

(۱) ایسی تحریف سے میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔

دعویٰ کرتا ہوں، میں خود ہی ماہر نہیں، ہاں اچھا پڑھنے والوں کا پتہ بتلا سکتا ہوں آپ ان سے جا کر صحیح طریقہ سیکھیے۔ پھر میں نے قراء پانی پت کا اور الٰہ آباد کے قاری صاحب کا پتہ بتلایا کہنے لگے بہت اچھا میں ان کے پاس جاؤں گا اور یہ جواب بھی خفگی کے لہجہ میں دیا، میں نے دل میں کہا کہ بس جاچکے، جانے والوں کی یہ صورت نہیں ہوتی، خیر میرے جواب سے تو خان صاحب لاجواب نہ ہوئے مگر میرے ایک عزیز نے اُن سے ایسی بات کہی جس سے وہ بالکل لاجواب ہوگئے وہ بات یہ کہی کہ قرآن مجید ایک شاہی فرمان ہے اس کو اس طرح پڑھنا چاہئے جس سے سننے والوں کو اس کا شاہی فرمان ہونا معلوم ہو، غور کیجئے اگر آپ کو جارج پنجم اپنا کوئی فرمان دیں کہ اس کو لوگوں کو سنادو تو کیا آپ اس کو اسی طرح موسیقی کے قاعدہ سے گا کر پڑھیں گے کہ حضور (آواز ہلاکر) بادشاہ سلامت (آواز ہلاکر) یوں فرماتے ہیں، (آواز ہلاکر) ہرگز نہیں اگر اس طرح آپ پڑھیں گے تو بادشاہ فوراً اپنے فرمان کو آپ سے چھین کر دربار سے آپ کو نکال دے گا بادشاہ کے کلام کو اس طرح پڑھنا چاہئے جس سے اس کی عظمت وصولت ظاہر ہو، نہ اس طرح جس طرح غزلیں پڑھی جاتی ہیں، تو دیکھئے ان خان صاحب کو میری تنبیہ اس لیے منکر معلوم ہوئی کہ دوسرے علماء نے ان کا قرآن سن لیا اور متنبہ نہ کیا اسی سکوت نے تو عوام کا دماغ بگاڑ دیا ہے۔

بے سود سوال

باقی علماء میں تنبیہ کرنے والے بھی ہیں مگر کم، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی سے ایک نیلگر نے سوال کیا فلانے حافظ جی نے پوچھا ہے حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما میں کون حق پر ہیں، مولانا نے فرمایا کہ بھائی تم کیا کام کرتے ہو کہا میں نیلگر ہوں فرمایا وہ حافظ جی کیا کرتے ہیں کہا جوتے بیچتے ہیں فرمایا جاؤ تم اپنے نیل کے مٹکے کی خبر لو اور کپڑے رنگو اور حافظ جی سے کہو جوتے بیچیں قیامت کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ جانیں اور حضرت امیر معاویہ جانیں ان کا قضیہ فیصلہ کے لیے تمہارے پاس نہ آئے گا اور نہ تم سے یہ سوال ہوگا کہ بتلاؤ ان دونوں میں سے کون حق پر تھے، واقعی خوب جواب دیا اسی طرح میرے پاس ایک شخص کا سوال آیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام۔ میں نے

جواب دیا کہ اگر آپ کو یہ معلوم ہوجائے کہ یہ دار الحرب ہے تو آپ کیا کریں گے؟ بس اس کے بعد پھر سوال نہیں آیا، بات یہ ہے کہ آج کل مذاق ایسا بگڑا ہے کہ عوام تو عوام خواص کو بھی فضول سوالات کا مضر ہونا معلوم نہیں اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس سے قلب پر بھی کچھ اثر ہوتا ہے، یہ مضمون اس پر چلا تھا کہ ''ترک اکل'' خود مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود اس طریق میں جمعیت قلب ہے اور وہ زیادہ تقلیل غذا سے بھی فوت ہوجاتی ہے تو اس حالت میں یہ شخص تشبہ بالملئکہ سے محروم ہوگا اور یہ کلام اس پر شروع ہوا تھا کہ ذکر اللہ سے راحت ہوتی ہے اور وہ غذائے جسمانی کے قائم مقام بن جاتا ہے اور نماز میں ذکر اللہ ہی ہے، پس اب تو نماز بھی سہل ہوگئی اور اس کا ضروریات شرعیہ میں سے ہونا معلوم ہے تو دیکھئے کہ کتنی آسان ہے پس میرا دعویٰ واضح ہوگیا کہ جو امور تکویناً یا تشریعاً زیادہ ضروری ہیں وہ سب سے زیادہ سہل ہیں۔

ایک قاعدہ کلیہ

اب میں اصل مضمون شروع کرتا ہوں جو صاحب فرمائش کی رعایت سے سہل ہی اختیار کیا گیا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۔(۱) اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور ﷺ کو حکم فرمایا ہے کہ میرے بندوں کو دو باتیں پہنچادو اور ظاہر ہے کہ ہر فعل اختیاری کسی غایت کے لیے مطلوب ہوتا ہے تو اس فعل اختیاری کی بھی کوئی غایت ہونا چاہئے یعنی یہ کہ ان باتوں کے پہنچانے سے کیا مقصود ہے اور اس وقت یہ بات میری زبان سے بڑے کام کی نکلی ہے کہ ہر قول اور ہر فعل اختیاری کسی نہ کسی غایت کے لیے مطلوب ہوتا ہے پس ہر بات اور ہر کام میں یہ سوچنا چاہئے کہ اس کی غایت کیا ہے جس بات اور جس کام کی کچھ غایت معلوم نہ ہو وہ فضول ہے اور غایت معلوم ہو مگر مفید نہ ہو تو وہ بھی فضول ہے اور اگر وہ غایت کوئی ضرر ہو لازم یا متعدی(۲) تو وہ کام مضر ہے۔ اس قاعدہ سے آپ کو اپنے

(۱) ''اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ میرے بندوں کو بتلادیں کہ میں غفور الرحیم ہوں اور میرا عذاب بھی بڑا دردناک عذاب ہے'' الحجر: ۴۹/۱۵ (۲) باعث نقصان ہو خود اس کو ہو یا دوسروں کو بھی ہو۔

افعال واقوال کا حسن وقبح اور لغو یا مفید ہونا(۱) آسانی سے معلوم ہوجائے گا، میں عوام سے کہتا ہوں کہ تم جو علماء سے سوالات کیا کرتے ہو ان میں پہلے یہ سوچ لیا کرو کہ اس سوال کی غایت کیا ہے، بعض اوقات تو معلوم ہوگا کہ غایت کچھ بھی نہیں چنانچہ پوچھنے پر اقرار کرتے ہیں کہ غایت تو کچھ نہیں ویسے ہی سوال کرلیا تھا اس کا فضول ہونا اور لغو وبیکار ہونا تو ظاہر ہے اور بعض لوگ بڑی غایت یہ بتلاتے ہیں کہ ایک مخالف نے یہ سوال کیا تھا مگر یہ بھی لغو غایت ہے کیونکہ مخالف کا جواب وہ دے جو عالم ہو جاہل کو مخالف کے منہ نہ لگنا چاہئے کیونکہ اس طرح کام کہاں تک چلے گا گھڑے کا پانی کب تک باقی رہے گا کسی نہ کسی دن ختم ہوجائے گا۔ کام تو کنویں ہی سے چلے گا جس میں ہر دم آمد ہو تم نے ایک بات کا جواب ہم سے پوچھ کر دے دیا کل کو وہ اور کوئی سوال کرے گا اس کا جواب کیونکر دو گے اور جب یوں کام نہیں چل سکتا تو یہ حرکت لغو ہوئی اور یہ غایت بھی فضول ہوئی بس مخالف کا تو سہل جواب یہی ہے کہ اس سے صاف کہہ دو کہ بھائی ہم تو جاہل ہیں اگر تم کو سوال کرنا ہے تو ہمارے علماء کے پاس جاؤ وہ جواب دیں گے اور اگر جاہل کہنے سے شرم آتی ہے تو اجہل کہہ دیا کرو یہ لفظ جاہل کہنے سے آسان ہوگا کیونکہ تم کو اس کے معنی کی خبر نہیں اور جس سے کہو گے اس کو بھی خبر نہیں، تو تم کو اجہل کہنے میں شرم نہ آئے گی، جیسے مولانا محمد قاسم صاحب کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوتا تھا جس کو لوگ نبیا نبیا کہتے تھے ایک دفعہ اس نے مولانا سے درخواست کی کہ میرا ایک خط لکھ دیجئے مولانا نے خط لکھ دیا جب اس کا نام لکھنے لگے تو اس نے کہا نبیا نہ لکھئے نبی الدین لکھئے مولانا نے مزاحًا فرمایا نہیں نبیح الدین ہوگا اور یہ نباح سے مشتق ہے جس کے معنی بھونکنے کے ہیں مگر اس کو تو لغت کی کچھ خبر نہ تھی وہ اس کو گاتا پھرتا تھا کہ میرا نام نبیح الدین ہے مجھے نبیا نہ کہا کرو لوگ ہنستے تھے کہ بے وقوف یہ تو بہت برا نام ہے وہ کہتا واہ مولانا نے میرا نام یہی لکھا ہے اسی طرح جہاز میں ہمارے ایک بھوپالی صاحب نے ایک بخاری سے دل لگی کی اور کہا آؤ ہم تم کو اردو سکھلائیں وہ اس پر تیار ہوگیا تو آپ نے سب سے اول اس کو یہ سکھلایا کہ یوں کہو میں گدھا ہوں میں گدھا ہوں اور کہہ دیا کہ پہلے اس سبق کو یاد کرلو پھر آگے

(۱) اچھا برا ہونا بیکار و مفید ہونا۔

پڑھائیں گے وہ بے چارہ اس کو یاد کر رہا تھا پھر وہ میرے پاس دوڑے ہوئے آئے کہ آؤ ایک تماشا دکھلائیں گے میں گیا تو وہ بخاری بڑے شوق سے پڑھ رہا تھا کہ میں گدھا ہوں میں گدھا ہوں میں نے ان سے کہا کہ یہ کیا واہیات حرکت ہے اردو سکھلانے کے لیے بھی آپ کو یہی لفظ ملا تھا۔ تو جیسے اس بخاری کو یہ لفظ آسان تھا کیونکہ معنی کی خبر نہ تھی اسی طرح آپ کو اجہل کہنا آسان ہوگا پس دوسروں کو جواب دینے کے لیے سوال کرنا لغو ہے اور آج کل یہ مرض بہت زیادہ ہے لوگ اپنے واسطے سوال بہت کم کرتے ہیں زیادہ تر سوالات اس لیے کئے جاتے ہیں تاکہ دوسروں کا منہ بند کریں بس وہ حال ہے کہ ؎

ہر کسے ناصح برائے دیگراں　　　ناصح خود یافتم کم درجہاں(۱)

نیت کا فرق

دوسروں کی اصلاح کی فکر تو وہ کرے جو اپنی اصلاح سے فارغ ہو گیا ہو تم کو تو ابھی اپنے ہی امراض سے فراغت نہیں تم دوسروں کی فکر میں کیوں پڑتے ہو پس عوام کو چاہئے کہ جو سوال کریں اپنی ضرورت سے کریں اسی طرح آج کل مناظرہ بھی بہت مضر ہے کیونکہ اس کی بھی کچھ غایت محمودہ نہیں بس زیادہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ خصم (۲) کو ذلیل کیا جائے اور اپنی بات کو اونچا کیا جائے تحقیق حق مقصود نہیں کل کا واقعہ ہے کہ ایک اخبار میں غیر مقلدوں کے مقابلہ میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں مولوی محمد صدیق حسن صاحب نواب بھوپال کا ایک مضمون بھی درج تھا جو غیر مقلدوں پر الزام قائم کرنے میں بہت مفید تھا میں نے ناقل مضمون سے اس قول کا حوالہ پوچھا تو انہوں نے اس کا حوالہ مع صفحہ وسطر اور اصلی عبارت کے میرے پاس لکھ کر بھیج دیا مگر ساتھ میں یہ درخواست بھی کی کہ ابھی اس حوالہ کو شائع نہ کرنا اچھا ہے ذرا غیر مقلدین پریشان ہوں اور جب ان کو یہ قول نہ ملے تو وہ یوں کہیں کہ مولوی صدیق حسن صاحب کی طرف اس قول کی نسبت غلط ہے اس وقت ہم صفحہ وسطر وعبارت کا حوالہ شائع کر کے ان کا منہ بند کریں گے یہ درخواست پڑھ کر مجھے بہت افسوس ہوا کہ مضمون تو اس شخص نے بہت عمدہ لکھا مگر افسوس

(۱) ”ہر شخص دوسروں کے لیے ناصح ہے اپنے آپ کو نصیحت کرنے والا میں نے بہت کم پایا ہے“ (۲) مدمقابل۔

نیت اچھی نہیں یہ لوگ ہدایت کے لیے مناظرہ نہیں کرتے بلکہ محض اپنی بات کو اونچا کرنے کے لیے مناظرہ کرتے ہیں اگر ہدایت منظور تھی تو خصم کے انکار کا انتظار کیوں ہے اور اس کو پریشان کیوں کیا جاتا ہے اول ہی سے حوالہ کیوں نہ شائع کر دیا۔ اس پر مجھے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مقولہ یاد آتا ہے کہ آپ نے اپنے صاحبزادہ حماد کو نصیحت فرمائی تھی کہ دیکھو مناظرہ کبھی نہ کرنا انہوں نے عرض کیا کہ میں نے تو آپ کو بارہا مناظرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے پھر آپ مجھے کیوں منع فرماتے ہیں؟ ارشاد فرمایا کہ ہم تو مناظرہ اس نیت سے کرتے تھے کہ شاید خصم کے منہ سے حق بات نکل جائے تو ہم اس کی بات کو مان لیں اور تم لوگ مناظرہ اس نیت سے کرتے ہو کہ اللہ کرے خصم کے منہ سے حق بات کبھی نہ نکلے بلکہ جو بات نکلے باطل ہی نکلے تاکہ تم اس کا رَد کر سکو واقعی آج کل یہی حالت ہے بلکہ اس سے بھی بدتر، کیونکہ اس وقت جو یہ تمنا ہوتی تھی کہ خصم کے منہ سے باطل ہی نکلے حق نہ نکلے اس تمنا کا منشا یہ تھا کہ وہ حضرات حق بات کو رد کرنا نہ چاہتے تھے بلکہ حق بات کے رَد سے شرماتے تھے اس لیے یہ تمنا تھی کہ خصم کے منہ سے حق نہ نکلے تاکہ رد کر سکیں اور اب تو مناظرہ میں اول ہی سے یہ نیت ہوتی ہے کہ خصم کی ہر بات کو رَد کریں گے خواہ حق ہو یا باطل اور اس کا مضر ہونا بدیہی ہے مگر کسی کو اس کے ضرر کا احساس نہیں کیونکہ لوگوں کو اس کی عادت ہی نہیں کہ اپنے افعال واقوال کی غایت کو سوچیں اگر وہ غایت کو سوچ کر کام کیا کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ یہ مناظرہ سراسر مضر اور نقصان دہ ہے پس یہ بڑی سخت غلطی ہے کہ کوئی بات زبان سے کہیں یا قلم سے لکھیں اور اس کا کوئی بھی نتیجہ نہ ہو اسی واسطے دین تباہ ہو رہا ہے اور زیادہ وقت فضولیات میں گزر رہا ہے بلکہ مضرات میں (۱)، چنانچہ اس وقت بھی خانقاہ میں ایک صاحب موجود ہیں جنہوں نے میرے پاس ایک تحریر بھیجی جس میں بہت سی باتیں لغو تھیں بلکہ بعض میں گستاخی تھی اور اس کا منشا وہی مرض ہے کہ غایت سوچ کر نہیں لکھتے بس جو جی میں آیا لکھ مارا۔ اگر سوچ کر کام کیا جائے تو ان لغویات ومضرات کا بہت سا حصہ حذف ہو جائے۔

(۱) نقصان دہ باتوں میں۔

اصلاح کی صورت

پھر اگر ایسے لوگوں کو تنبیہ کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ خطا ہوگئی معاف کرو، بھلا میرے معاف کردینے سے کیا اُن کی اصلاح ہوجائے گی یہ تو ایسا ہوا کہ جیسے ایک بڑھیا حج کو گئی جب طواف کے بعد سعی کی نوبت آئی تو ایک دو چکر میں بڑھیا تھک گئی، اب وہ مطوف سے کہتی ہے کہ اے معلم صاحب بس اب تو معاف کرو معلم نے کہا بڑی بی اگر حج میرے باوا کا ہوتا تو میں معاف کردیتا حج تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہے، میرے معاف کردینے سے تمہارا حج تو ادا نہ ہوجائے گا ایسے ہی یہ لوگ جو اللہ کا راستہ پوچھنے آتے ہیں اور جب ان کو طریقہ بتلایا جاتا ہے تو مجھ سے کہتے ہیں کہ خطا معاف کرو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ میرے معاف کرنے سے کیا تمہاری اصلاح ہوجائے گی ہرگز نہیں اصلاح تو جب ہوگی کہ تم ان باتوں کو چھوڑدو جو سدِ راہ ہیں (۱) جن میں سے ایک بات یہ ہے کہ فضول اقوال واعمال سے احتراز کرو۔ اس لیے میرے یہاں یہ کہنا کافی نہیں ہوتا کہ غلطی ہوگئی معاف کرو۔ بلکہ میں اس پر یہ سوال کرتا ہوں کہ اپنی غلطی بیان کرو کہ اس تحریر میں تم سے کیا غلطی ہوئی۔ اس سوال کے جواب میں ایک صاحب لکھتے ہیں کہ اللہ کے لیے یہ سوال نہ کرو میں مرجاؤں گا گویا میں عزرائیل ہوں میں نے لکھا کہ جب تم کو میرے سوال کے جواب میں موت کا خوف ہے تو پھر میرے پاس کیوں آئے تھے کسی دوسرے کے پاس جاؤ جس کے جواب دینے میں موت کا خوف نہ ہو بلکہ حیات کی اُمید ہو، ذرا غور تو فرمائیے کہ کیا طالب اصلاح کی یہی شان ہوتی ہے جو مربی کو ملک الموت سمجھے اور اس سے ایسا ڈرے جیسا موت کے فرشتہ سے۔ اور یہ ساری خرابی دین کو چھوڑنے کی ہے واللہ اگر دین کو اختیار کیا جائے تو راحت ہی راحت ہے اور میں ان صاحبوں سے جو سوالات کرتا ہوں وہ اللہ ہی سے ملانے کے لیے کرتا ہوں جس کا انجام راحت ہے اور راحت کیوں نہ ہو جبکہ اس سے اللہ ملتا ہے ؎

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ　　جنت ست آں گرچہ باشد قعرِ چاہ (۲)

---

(۱) جو راہ تصوف میں رکاوٹ ہیں (۲) ''جس جگہ محبوب ہو خوش وخرم بیٹھ وہ جگہ مرتبہ میں آسمان سے بلند ہے، زمین سے پست''۔

اور ؎

گفت معشوقے بہ عاشق کاے فتی   تو بہ غربت دیدہ ای بس شہرہا
پس کدامی شہر زانہا خوشتر ست   گفت آن شہرے کہ دروے دلبر ست (۱)

اور جیسے وصلِ محبوب اصل راحت ہے اسی طرح فراقِ محبوب اصل مصیبت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

از فراق تلخ می گوئی سخن   ہر چہ خواہی کن ولیکن ایں مکن (۲)

اور عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

شنیدہ ام سخنی خوش کہ پیر کنعاں گفت   فراقِ یار نہ آن می کند کہ بتوان گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر   کنایتیست کہ از روزگار ہجران گفت (۳)

راحت دین ودنیا

مگر افسوس کہ لوگ آج کل وصال کو معاملتاً فراق سمجھتے اور فراق کو وصال جانتے ہیں اگر کوئی ان کی اصلاح کرنا چاہے تاکہ اللہ سے ان کو ملادے تو اس کو ملک الموت (۴) سمجھتے ہیں اور جو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دے کچھ نہ کہے جس سے ہمیشہ فراق میں مبتلا رہیں اس سے خوش ہیں بس اب اس کا علاج میرے پاس بجز اس کے کیا ہے کہ یوں کہہ دوں۔ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ (۵) انکشاف حقائق کے وقت کے منتظر رہو اس وقت معلوم ہوگا کہ تمہارا خیر خواہ کون تھا اور اگر ذرا انصاف سے دیکھا جائے تو معلوم ہوسکتا ہے کہ میں کسی ایسی بات کی تعلیم نہیں دیتا جو فی نفسہٖ دشوار ہو یہ اور بات ہے کہ کسی مبتدی کو اس لیے دشوار ہو کہ وہ اس کی ضد کا عادی ہو رہا ہے جیسے بچہ کو روٹی پر اکتفا کرنا اول اول دشوار ہوتا ہے کیونکہ وہ دودھ کا عادی ہو رہا ہے۔

مگر کیا بچہ کی دشواری کی وجہ سے روٹی کھانے کو فی نفسہٖ دشوار کہا جائے گا ہرگز

(۱) ''کسی معشوق نے عاشق سے پوچھا کہ تم نے سیاحت میں کون سا شہر پسند کیا تو اس نے کہا سب میں عمدہ وہ شہر ہے جہاں محبوب کی زیارت ہو'' (۲) ''فراق کی باتیں کرتے ہو اور جو چاہو سو کرلو مگر یہ نہ کرو'' (۳) ''میں نے سنا پیر کنعان نے بہت اچھی بات کہی (کہ محبوب کی جدائی وہ حالت پیدا کرتی ہے جو بیان میں نہیں آسکتی، قیامت کے ہولناک واقعات بیان کرنے کو روزگار ہجر کا ایک کنایہ کہنا چاہیے)'' (۴) موت کا فرشتہ (۵) التوبہ: ۹/ ۵۲۔

نہیں مثلاً میں یہ کہتا ہوں کہ فضول باتوں کو چھوڑو اور جس بات کی کچھ غایت نہ ہو اس سے احتراز کرو بتلایئے اس میں کیا دشواری ہے نہایت آسان بات ہے کیونکہ اس میں کچھ نہیں کرنا پڑتا بلکہ بہت سے کاموں کو ترک کرنا پڑتا ہے اور قاعدہ عقلیہ ہے کہ ترک میں بہ نسبت فعل کے سہولت ہے مگر جو لوگ فضولیات کے عادی ہوں ان کو یہ آسان بات بھی دشوار معلوم ہو تو اس کا کیا علاج، بس اس کا علاج تو یہی ہے کہ ان کی اس عادت کو چھڑایا جائے جیسے بچہ کا دودھ چھڑایا جاتا ہے۔ پھر بعد میں ان کو خود معلوم ہوگا کہ اس میں کس قدر سہولت ہے جیسے بچہ کو دودھ چھوڑنے کے بعد روٹی کھانے کی سہولت کا علم ہوجاتا ہے اور سب سے بڑی دلیل اس کی سہولت کی یہ ہے کہ یہ تعلیم دین کی تعلیم ہے اور دین کے اختیار کرنے میں راحت ہی راحت ہے۔ خصوصاً دین محمدی ﷺ کے وہ سب ادیان سے اکمل وافضل واسہل ہیں(۱) اس میں تو دشواری ہے ہی نہیں بلکہ اس کے ترک میں رنج وکلفت ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ دیندار کو بیماری یا غم اور کلفت پیش نہیں آتی، نہیں! جو مصائب تم کو پیش آتی ہیں اس کو بھی پیش آتی ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ تمہارے دل کو مصیبت میں چین نہیں رہتا بے چین ہوجاتے ہو اور دیندار کے دل کو جمعیت حاصل ہوتی ہے جس کا منشا قربِ محبوب ہے اور محبوب بھی کون حضرت حق سبحانہ جو کسی وقت ہم سے جدا نہیں ہیں پس جب دیندار کو کلفت پیش آتی ہے اور اس کے ساتھ یہ خیال بھی آتا ہے کہ یہ محبوب کی طرف سے آئی ہے تو اس کو اس کے کہنے میں لذت آتی ہے ؎

از محبت تلخہا شیریں بود (۲)

اور اس وقت اگر اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کلفت تمہارے بجائے کسی دوسرے کو دے دی جائے تو وہ یوں کہتا ہے ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی (۳)

اور صاحبو یہ کلیہ جو میں نے بیان کیا ہے کہ سوال وہ کرو جس کی ضرورت ہو، بات وہ کرو جس کی کچھ غایت ہو، کام وہ کرو جس کا کچھ مفید نتیجہ ہو اور جس کام کی غایت

(۱) سب دینوں سے کامل افضل اور آسان ہے (۲) "محبت میں ناگواریاں بھی اچھی معلوم ہوتی ہیں"
(۳) "دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ خنجر آزمائی کریں"۔

معلوم نہ ہو اس کو چھوڑ دو، جس بات کا کچھ نتیجہ نہ ہو اس کے درپے نہ ہو، اس میں دین کی راحت تو ہے ہی واللہ دنیا کی بھی اسی میں راحت ہے۔ فضول باتوں سے ہی عداوت وبغض وحسد وکینہ پیدا ہوتا ہے چنانچہ جھوٹ اور غیبت وشکایت سب انہی فضول ولغو باتوں کے افراد ہیں اور یہی سارے فسادوں کی جڑ ہیں اور جھوٹ اور غیبت وغیرہ کے علاوہ بھی جو بے فائدہ باتیں ہیں ان سے بھی بعض دفعہ برے نتائج پیدا ہوتے ہیں بعض دفعہ انسان پچھتاتا ہے کہ میں نے یہ بات کیوں کہی تھی دوسرے ان فضول قصوں میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے بعد میں انسان کو اس کا بھی قلق ہوتا ہے (۱) بشرطیکہ اس میں ذرا بھی سلامی ہو اور جو شخص محض ضروری باتوں کا عادی ہو فضول ولغو سے احتیاط کرتا ہو وہ ان سب پریشانیوں سے محفوظ رہے گا اس کو راحت ہی راحت ہے بس سوالات لایعنی تو پہلے ہی دن حذف ہو جائیں گے اب اس کا سارا وقت ضروری کاموں اور ضروری باتوں میں صرف ہوگا تو جب اس میں دنیا کی بھی راحت ہے اور دین کی بھی پھر کیا وجہ ہے کہ اس کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔

غرض وغایت

اگر کوئی تم سے فضول بات پوچھے یا ایسی بات پوچھے جس کا جواب تم کو معلوم نہیں تو صاف کہدو کہ ہم نہیں جانتے میں سچ کہتا ہوں کہ اس جواب میں ایسی راحت ہے جو کسی جواب میں نہیں مگر اس کو سستا اور عام نہ کر دینا کہ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ تم مسلمان ہو یا کافر تو وہاں بھی یہی کہو کہ ہم نہیں جانتے۔ جیسے ایک بدا ستعداد طالب علم نے وقت رخصت استاد سے پوچھا کہ مجھ کو کچھ آتا جاتا تو ہے نہیں اگر وطن پہنچ کر کسی نے کوئی علمی سوال کیا تو کیا جواب دوں گا، استاد نے کہا کہ جب تم سے کوئی سوال کیا جایا کرے تو یہ کہہ دیا کرو کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے اس طرح تمہارا پردہ فاش نہ ہوگا لوگ سمجھیں گے کہ بڑا محقق ہے کیونکہ اکثر مسائل ایسے ہی ہیں جن میں علماء کا اختلاف ہے مگر اس طالب علم کو گھر کی عقل نہ تھی، اس لیے اس نے اس جواب کو ایسا عام کیا کہ ایک شخص نے یہ پوچھا کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں تو آپ نے یہاں بھی وہی جواب دیا کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے اس پر لوگ ہنس

(۱) رنج ہوتا ہے۔

پڑے اور سمجھ گئے کہ اس کو خاک علم نہیں محض اپنی جہالت چھپانے کو اس نے یہ سبق یاد کیا ہے۔ یہ تقریر اس پر چلی تھی کہ میں نے کہا تھا کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں حضور کو دو باتیں پہنچانے کا امر فرمایا ہے اور شریعت وعقل دونوں کی تعلیم دیتی ہے کہ ہر قول کے لیے کوئی غایت ہونا چاہئے اور ہر فعل کسی غایت کے لیے مطلوب ہوتا ہے پس افعال کی بھی ایک غایت ہے پس ہم کو اپنے اعمال میں غور کرنا چاہئے کہ کوئی کام غایت سے خالی نہ ہو، اقوال میں بھی غور کرنا چاہئے کہ کوئی بات بدون غایت کے نہ ہو عارف فرماتے ہیں ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو　　　کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت این معمارا(۱)

اس میں اسی کی تعلیم ہے کہ چونکہ اسرار کا انکشاف (۲) متوقع نہیں اس لیے اسرار کے درپے نہ ہونا چاہئے کہ فضول ہے بس ضروری کام میں لگنا چاہئے اسی طرح عقائد کی بھی ایک غایت ہے مثلاً مسئلہ تقدیر کی غایت خود قرآن مجید میں یہ بتلائی گئی ہے: {لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ} (۳) یعنی تاکہ کسی چیز کے فوت ہونے سے تم رنج نہ کرو اور کسی نعمت کے حاصل ہونے پر اتراؤ نہیں بلکہ ہر حالت میں یہ سمجھ کر کہ تقدیر میں یوں ہی تھا صبر وشکر کرو اسی طرح عقیدۂ اللہ واحد کی بھی ایک غایت ہے وہ رضائے الٰہی ہے۔ رہا یہ کہ رضائے الٰہی کی کیا غایت ہے اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے ان سے اس کی وجہ پوچھ لینا۔ قیامت میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے سب ملیں گے وہاں یہ سوال کر لینا کہ حضرت آپ کے راضی ہونے کی کیا غایت تھی ہمارا فعل نہیں ہے کہ ہم اُس کی غایت بتلا دیں اور دوسرا جواب اس سوال کا یہ ہے کہ منتہی غایت کی کوئی غایت نہیں ہوتی وہ خود مقصود بالذات ہوتی ہے تیسرا جواب وہی ہے جو میں سب کو ابھی بتلا رہا تھا تو میں خود اس سے کیوں نہ کام لوں یعنی لااعلم کہ ہم کو اس کا جواب معلوم نہیں۔

مسئلہ قدر

یہ معمولی جواب نہیں بلکہ ایسا قیمتی جواب ہے کہ واللہ اسی کی بدولت مجھے ایک

(۱) "ضروری کاموں میں مشغول ہو، اسرار وانکشافات زمانہ کے پیچھے نہ پڑو اس معمہ کو کسی شخص نے حل کیا نہ حل کر سکے" (۲) اسرار ورموز کا کھل جانا (۳) سورۃ الحدید: ۵۷/ ۲۳۔

بڑے ورطۂ ہلاکت سے نجات ہوئی مجھ پر ابھی ایک حالت گزری ہے جس سے کئی مہینہ تک ایک ورطۂ ظلماء میں مبتلا رہا اور وہ مصیبت ایک صوفی صاحب کی اسرار کی کتابیں دیکھنے سے پیش آئی اسی واسطے میں اپنے دوستوں کو وصیت کرتا ہوں کہ صوفیہ اہل اسرار کی کتابیں ہرگز نہ دیکھیں کیونکہ اس میں خود بلا کو سر لینا ہے اور میں نے تو ایک خاص ضرورت سے اس کتاب کو دیکھا تھا کہ ان صوفی پر سے لوگوں کے اعتراضات کا رفع کرنا مقصود تھا مگر اتفاق سے بلا قصد کے ایک جگہ مسئلہ قدر کے متعلق کچھ مضمون نظر پڑ گیا بس قیامت آ گئی اور ایمان پر خطرہ ہو گیا، پھر جب تک میں شبہات کے جوابوں میں غور کرتا رہا پریشانی بڑھتی رہی آخر کار نجات جو ہوئی تو اسی بات سے ہوئی کہ ہم کیا جانیں ہمارا علم ہی کیا ہے ہم جانتے ہی کیا ہیں پھر ہم اس مسئلہ میں غور ہی کیوں کریں۔

واللہ اس وقت قدر ہوئی حضور ﷺ کے اس امر کی کہ مسئلہ قدر میں غور نہ کرو خدا ناس کرے اُن ظالموں کا جو اس ارشاد کی قدر نہیں کرتے اور اسلام پر شبہ کرتے ہیں کہ مسئلہ قدر پر جو اشکالات پڑتے ہیں اُن کا جواب اسلام میں ہے ہی نہیں اس لیے غور کرنے اور گفتگو کرنے سے منع فرما دیا گیا ہے ارے احمق سارے جوابوں کے بعد بھی تسلی اسی سے ہوگی کہ یوں کہہ دو کہ ہم نہیں جانتے، رہے اشکالات تو لاؤ تم اشکالات پیش کرو، ہم سب کا جواب ایسا دیں گے کہ تم لاجواب اور ساکت ہو جاؤ گے مگر تسلی نہ ہوگی تسلی اور شفا اسی سے ہوگی کہ اس میں غور و تفکر ترک کر دو اس وقت قدر ہوگی وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا(۱) کی کہ واقعی ہمارا علم کچھ نہیں اور ہم کچھ نہیں جانتے، غرض ہر چیز کی ایک غایت ہے اعمال کی بھی اور عقائد کی بھی اب تم کم از کم تین دن تک یہ مراقبہ کرو اپنے اعمال و اقوال میں غور کرو تو معلوم ہوگا کہ صبح سے شام تک زیادہ کام اور زیادہ باتیں فضول ہی ہوتی ہیں پھر معلوم ہوگا کہ ساری عمر برباد ہی ہوئی پھر دیوار میں سر مارو اور اپنی حالت پر روؤ، مگر میں نے جو دیوار میں سر مارنے کو کہا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ مطلوب ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مقتضاء اس ضیاع عمر پر تاسف کا فی نفسہٖ یہ ہے ورنہ حق تعالیٰ تو عاشق نواز ہیں وہ اپنے عاشقوں کا سر نہیں پھوڑواتے۔

(۱) سورۃ الاعراف: ۱۷/ ۸۵۔

اطاعت شیخ

اس پر ایک شیخ کی حکایت یاد آ گئی کہ ان سے ان کے کسی مرید نے شکایت کی مجھے ترقی نہیں ہوتی، شیخ نے اول تو اس کی تدابیر بتلائیں جب ان تدابیر سے بھی نفع نہ ہوا اور بار بار اس نے شکایت کی تو شیخ کو غصہ آ گیا اور کہا میں کیا کروں تیری قسمت میں ہی نہیں، جا کر دیوار میں سر مار لے، مرید طالب صادق تھا اس نے سچ مچ دیوار میں جا کر سر پھوڑ لیا مرید کو تو فوراً بسط ہو گیا اور راستہ کھل گیا، اطاعت شیخ کی وجہ سے، مگر شیخ پر معاً عتاب ہوا الہام ہوا او نامعقول ہمارے طالبوں کا سر پھوڑواتا ہے تجھ کو شرم نہیں آتی۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ اگر شیخ سے طریق تربیت میں غلطی بھی ہو جائے جس پر خواہ اس کو محبوبانہ عتاب بھی ہو جائے لیکن پھر بھی مرید کو اس پر عمل کرنے سے نفع ہی ہوگا کیونکہ نفع دینے والے تو حق تعالیٰ ہیں جب وہ طالب کی طلب صادق کو دیکھتے ہیں اور اس کو اپنے ولی کی اطاعت میں پختہ دیکھتے ہیں تو اس کے حال پر کرم فرما دیتے ہیں، چاہے شیخ سے غلطی ہی ہوئی ہو اس راستہ میں اطاعت وانقیاد بڑی چیز ہے، اطاعت شیخ کے ساتھ کسی کو محروم ہوتے ہوئے نہیں دیکھا اور خودرائی کے ساتھ کسی کو کامیاب ہوتا ہوا نہیں دیکھا مولانا فرماتے ہیں ؎

فہم وخاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ (۱)

اور فرماتے ہیں ؎

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجا پستی ست آب آں جا رود (۲)

اور اگر کسی کو کسی شیخ سے نفع ہی نہ ہوتا ہو تو اُس کو دوسرے شیخ کی طرف رجوع کرنے کی اجازت ہے مگر یہ لازم ہے کہ پہلے شیخ کی شان میں گستاخی نہ کرے کیونکہ مربی اول وہی ہے اور مربی کے ساتھ بے ادبی وگستاخی سخت چیز ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

بے ادب را اندریں رہ بار نیست جائے او بر دار شد در دار نیست (۳)

(۱) ''فہم وخاطر تیز کرنا یہ حق پہنچنے کی راہ نہیں ہے فضل خداوندی سوائے شکستہ لوگوں کے اور کسی کو قبول نہیں کرتا'' (۲) ''جس جگہ بیماری ہوتی ہے وہاں دوا کی ضرورت ہوتی ہے جہاں پستی ہوتی ہے وہاں پانی پہنچتا ہے'' (۳) ''بے ادب کے لئے اس راہ میں کچھ حصہ نہیں اس کا مقام دار پر ہے نہ کہ دربار میں ہے''۔

تو حق تعالیٰ اپنے عشاق کا سر نہیں چھوڑواتے وہ اس حالت میں بھی آپ کی تسلی کرتے ہیں کہ عمر گزشتہ برباد گئی تو اس کا غم نہ کرو آئندہ کی فکر کرو اسی کو سنبھال لو حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے اگر تو زمین وآسمان کے برابر بھی گناہ لے کر میرے پاس آئے اور مجھ سے مغفرت چاہے تو میں سب کو بخش دوں گا اور گناہوں کی کثرت کی پرواہ نہیں کروں گا پس عمر گزشتہ کے ضائع ہوجانے کا بھی علاج موجود ہے۔ لاعلاج کوئی مرض نہیں وہ علاج یہ ہے کہ توبہ کرو مگر توبہ کا طریقہ بھی کسی شیخ ہی سے پوچھو اور جو کچھ وہ بتلائے پھر اس میں اپنی رائے نہ لگاؤ۔ آج کل یہ خودرائی کا مرض بہت پھیل رہا ہے اسی واسطے لوگوں کو راستہ نہیں ملتا، ہمارے خواجہ صاحب نے ایک شخص کو امراض کا یہ علاج تجویز کیا کہ ہر نماز کے بعد نمازیوں سے یوں کہا کرو کہ میرے اندر فلاں فلاں امراض ہیں دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ مجھے ان سے شفا دیں تو وہ طالب صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت یہ علاج تو کچھ ٹھیک نہیں کیونکہ اب تک تو میں خفیہ طور سے گناہ کرتا تھا لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ میرے اندر بدنگاہی اور بدکاری کا مرض ہے۔ اب یہ امراض ظاہر ہوجائیں گے پھر تو گناہوں پر اور بھی جرأت بڑھ جائے گی بس اس کا جواب وہی ہے جو مولانا نے فرمایا ہے ؎

فہم وخاطر تیز کردن نیست راہ　　　جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ (۱)

ارے جب تم کو اتنا اجتہاد حاصل ہے کہ طبیب کی تجویزوں کو صحیح غلط بتاسکتے ہو تو تم سے کس نے کہا ہے کہ اس راستہ کو کسی سے پوچھو بس خود ہی طے کرلو مگر خود کیونکر طے کرلیں اتنا یہ بھی جانتے ہیں کہ خود طے نہیں کرسکتے افسوس نہ خود طے کرسکیں نہ جاننے والے کا اتباع کریں پھر کام کیونکر چلے۔

دخلِ ترغیب وترہیب

ہرچہ گیرد علتی علت شود　　　کفر گیرد کاملے ملت شود (۲)

ہائے ہم نے انا الغفور الرحیم کو لیا تو اسے بھی علت بنادیا اس کی وہ تفسیر کی

(۱) ”فہم وخاطر تیز کرنا یہ حق پہنچنے کی راہ نہیں ہے بلکہ شکستگی کی ضرورت ہے۔ بجز شکستہ لوگوں کے فضل خداوندی کسی کو قبول نہیں کرتا“ (۲) ”علتی جو اختیار کرتا ہے علت ہوتی یہ کامل اگر کفر بھی اختیار کرے تو ملت ہوگی“۔

جس سے حق تعالیٰ کی شان میں گستاخی ہونے لگی حالانکہ اُس میں تو حق تعالیٰ کی صفات کاملہ کا ذکر تھا اور کامل کی حالت اس کا عکس ہے کہ اس کے پاس جا کر علت بھی حکمت ہوجاتی ہے۔ ہم نے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بارہا اس کا مشاہدہ کیا ہے ایک دفعہ کسی نے شریف مکہ اور حکام کی شکایت حاجی صاحب کی مجلس میں کی جو صورۃً غیبت تھی مگر حضرت نے سنتے ہی فرمایا کہ ہاں بھائی آج کل اسماء جلالیہ کا ظہور ہورہا ہے۔ اس کے بعد مسئلہ توحید اور وحدۃ الوجود اور مسائل سلوک کی تحقیقات شروع ہوگئیں جس سے وہ غیبت علم وحکمت بن گئی آج کل گودڑ (۱) کا کاغذ بنتا ہے مگر ہم نے حاجی صاحب کے یہاں گودڑ کی کتاب بنتے ہوئے دیکھا ہے کہ کیسی ہی لغو اور فضول بات کسی نے کہی مگر حضرت نے اس پر ایک علم عظیم متفرع کردیا اسی لیے میں کہتا ہوں کہ حضرت اپنے وقت کے امام تھے اور اکثر محققانِ سلف سے بڑھے ہوئے تھے۔

گستاخی اور دلیری

میں یہ کہہ رہا تھا کہ علتی لوگوں نے غفور رحیم کو بھی علت بنالیا اور اس کو ترقی گناہ کا سبب بنادیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مغفرت ورحمت کو یاد کرکے گناہوں پر دلیر ہوگئے اور جہاں کسی نے روکا یا نصیحت کی تو صاف کہہ دیا کہ میاں تم کو کیا اللہ تبارک وتعالیٰ غفورالرحیم ہے وہ ہم کو اس حال میں بھی بخش دیں گے، سبحان اللہ! خوب سمجھے یہ مانا کہ حق تعالیٰ غفورالرحیم ہیں مگر بدرجہ اطلاق کس کے لیے جو گناہوں سے توبہ اور معذرت کرے اور اپنی حرکتوں پر نادم وپشیمان ہوکر حق تعالیٰ کے سامنے التجا اور گریہ وزاری کرے چنانچہ نص ہے: ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (۲) نہ اس کے لیے جو برابر گناہوں میں ترقی کررہا ہو اور ایک دن بھی اپنی حرکتوں پر نادم نہ ہوا اور دن بدن سرکشی پر پہلے سے زیادہ کمربستہ ہو کہ یہ تو پورا مقابلہ اور گستاخی ہے جس کی نسبت ارشاد ہے۔

(۱) گلے سڑے کپڑوں اور روئی کا (۲) "بے شک آپ کا پروردگار جن لوگوں نے نادانی سے گناہ کئے پھر اس کے بعد توبہ کی اور اپنی اصلاح کی بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار اس کے بعد (ان لوگوں پر) بڑا بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے" سورۃ النحل: ۱۶/ ۱۱۹۔

كَلَّا بَلْ سكتة رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (۱) مولانا اس گستاخی کی نسبت فرماتے ہیں ؎

از خدا جوئیم توفیق ادب		بے ادب محروم گشت از لطفِ رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد		بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد
از ادب پُر نور گشتہ است ایں فلک		وز اَدب معصوم و پاک آمد ملک
ہر کہ گستاخی کند اندر طریق		گردد اندر وادئ حیرت غریق (۲)

تم نے غفور رحیم کو یاد کر کے ایسا سبق لیا جس سے تمام عالم میں آگ لگا دی یہ تو تنبیہ ہے ان لوگوں کے لیے جو مغفرت ورحمت کے بھروسے گستاخیوں پر دلیر ہوتے ہیں آگے مولانا طریقہ بتلاتے ہیں اس کی مکافات کا کیونکہ دین میں ہر مرض کی دوا ہے اس گستاخی کی بھی دوا ہے وہ کیا ہے ؎

ہرچہ بر تو آید از ظلمات وغم		آں زبیبا کی و گستاخی ست ہم
چوں کہ غم بینی تو استغفار کن		غم بہ امر خالق آمد کارکن (۳)

اسکا علاج بھی وہی غفور رحیم ہے جس کو تم نے علت بنایا تھا اب اس کو حکمت بناؤ اور گناہوں سے رکنے کا ذریعہ بناؤ، اس گستاخی سے توبہ استغفار کرو اس حالت کے متعلق ارشاد ہے: نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۴) میرے بندوں کو خبر کردو کہ میں غفور الرحیم ہوں یعنی اگر وہ اپنے گناہوں اور گستاخیوں سے ترساں ولرزاں ہو کر مجھ سے معافی چاہیں گے تو میں سب جرم وگناہ معاف کردوں گا۔

(۱) ''بلکہ ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا جو کچھ انہوں نے کیا'' (۲) ''اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہم ادب کی توفیق طلب کرتے ہیں، بے ادب اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم رہتا ہے، بے ادب صرف اپنا ہی برا نہیں کرتا بلکہ تمام اطراف میں آگ لگا دیتا ہے، ادب کا پرنور ہونا کہ ان میں سورج، چاند اور تمام ستارے نورانی موجود ہیں فرشتوں کا معصوم اور پاک ہونا ادب ہی کی وجہ سے ہے، جو شخص راہ سلوک میں گستاخی کرتا ہے حیرت کے گڑھے میں ڈوبا رہتا ہے'' (۳) ''جو کچھ ظلمات وغم ومصائب تجھ کو پیش آتے ہیں وہ بھی گستاخی اور بے باکی سے وارد ہوتے ہیں۔ اگر تم کو غم پیش آئے تو فوراً استغفار کرو، اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے غم کارکن ہو کر آیا ہے'' (۴) سورۃ الحجر: ۱۵/۴۹۔

عنایت کی انتہا

صرف معافی ہی پر اکتفا نہ ہوگا بلکہ اس کے بعد رحمت وعنایت بھی ہوگی کیونکہ میں غفور ہونے کے ساتھ رحیم بھی ہوں چنانچہ بعض بندوں پر تو ایسا انعام ہوگا کہ حدیث میں آتا ہے محشر میں حق تعالیٰ ایک بندے کو بلائیں گے اور پوچھیں گے بتلاؤ تم نے فلاں گناہ کیوں کیا تھا اور یہ خطا کیوں کی تھی وہ بندہ ڈرے گا کہ اب میں جہنم میں گیا کیونکہ حق تعالیٰ اس کے سامنے اوّل صغائر کو پیش فرمائیں گے وہ ڈرے گا کہ کبائر کا تو ابھی نام بھی نہیں آیا اگر کبائر کا ذکر آیا تو بس جہنم سے ورے میرا ٹھکانا نہیں وہ اسی شش وپنج (۱) میں ہوگا کہ حق تعالیٰ حکم فرمائیں گے کہ ہم نے اس کو بخشا اور ہر گناہ کے عوض اس کو نیکیاں دے دو اب یہ شخص خود اپنے گناہوں کو گننا شروع کرے گا کہ اے پروردگار میں نے اور بھی بہت سے گناہ کئے ہیں جن کا یہاں تذکرہ بھی نہیں آیا مجھے ان کے عوض بھی نیکیاں ملنا چاہئیں چنانچہ اب گناہ گن گن کر ان کے برابر اس کو حسنات ملیں گے مگر یہ تو خبر نہیں یہ کون شخص ہوگا اس لیے ناز نہ کرنا کہ ہم بھی اسی طرح چھوٹ جائیں گے۔

پیش یوسف نازش و خوبی مکن　　جز نیاز و آہ یعقوبی مکن
ناز را روئے بباید ہمچو ورد　　چوں نہ داری گرد بد خوئی مگرد (۲)

بے جا ناز سے ایک دیہاتی جل کر خاک سیاہ ہو چکا ہے اس نے ایک کابلی کو دیکھا تھا کہ وہ اپنے گھوڑے کو بڑے پیار ومحبت سے بیٹا بیٹا کہہ کر دانہ کھلا رہا ہے اور گھوڑا کبھی ادھر منہ مارتا ہے کبھی اُدھر اور وہ کابلی کہہ رہا ہے کہ بیٹا کھاؤ بیٹا کھاؤ اس شخص نے اپنے دل میں کہا کہ افسوس ہماری بیوی ہم کو ذرا نہیں چاہتی وہ تو بڑی بے پروائی سے میرے سامنے کھانا رکھ کر چل دیتی ہے مجھ سے تو یہ گھوڑا ہی اچھا ہے تو اب ہم بھی گھر جا کر گھوڑا بنیں گے چنانچہ گھر آ کر بیوی سے کہا کہ ہم تو آج گھوڑا بنیں گے اُس نے کہا میری طرف سے چاہے تم گدھے بن جاؤ۔ غرض آپ گھوڑا بنے اگاڑی پچھاڑی باندھی گئی

(۱) ادھیڑ بن میں ہوگا (۲) "یوسف یعنی کامل کے سامنے ناز وخوبی یعنی دعویٰ اظہار کمال مت کرو بجز آہ ونیاز یعقوبی کے مت کرو، ناز کرنے کے لیے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے بدخوبی کے پاس مت جاؤ"۔

اور دم کی جگہ ایک جھاڑو باندھی اور توبرے میں کھانا بھروایا اور بیوی سے کہا تم ہمارے پاس بیٹھو جب ہم اِدھر اُدھر منہ ماریں تو تم کہنا بیٹا کھاؤ بیٹھا کھاؤ اس نے سب احکام کی تعمیل کی رات کا وقت تھا اور چراغ پیچھے رکھا ہوا تھا یہ گھوڑے صاحب جو اُچھلے کودے چراغ گر پڑا اور جھاڑو میں آگ لگ گئی اور رفتہ رفتہ اس کے کپڑوں میں لگی اور اس نے زیادہ کودنا شروع کیا مگر اگاڑی پچھاڑی بندھے ہونے سے یہ خود کچھ نہ کرسکا اور بیوی نے بھی نہ کھولا کیونکہ بے وقوف کی بیوی بھی بے وقوف تھی وہ دوڑی ہوئی دروازہ پر گئی اور محلہ والوں کو پکارا ارے دوڑو میرا گھوڑا جل گیا محلہ والوں کو اس کی حالت غربت وافلاس کی معلوم تھی سب جانتے تھے کہ اس کے یہاں گھوڑا کہاں اس لیے کسی نے بھی اس کی بات پر التفات نہ کیا سمجھے کہ مسخرا پن ہے اس عرصہ میں وہ گھوڑا جل کر مرنڈا ہوگیا تو بے جا ناز کا یہ انجام ہے۔ پس ناز نہ کرو بلکہ گناہوں سے توبہ کرو تائبین پر اللہ کی بڑی رحمت ہے۔

رحمت کی صورت

اس رحمت کی یہ حالت ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے رحمت کے ۱۰۰ حصے کرکے ایک حصہ تو دنیا میں رکھا جس کا اثر یہ ہے کہ کافروں گناہگاروں کو بھی رزق پہنچتا ہے اور اُسی کا یہ اثر ہے کہ لوگ باہم ایک دوسرے سے محبت کرتے اور ماں بچوں پر اور جانور اپنی اولاد پر جان دیتے ہیں اور حشر میں اللہ تبارک وتعالیٰ اس ایک حصہ کو ننانوے حصوں کے ساتھ ملاکر پورے ۱۰۰ حصوں سے مومنین پر رحمت فرمائیں گے نیز حدیث میں بنی اسرائیل کے ایک شخص کا قصہ آیا ہے کہ اس نے ننانوے خون کئے تھے اس کے بعد اُس کو تنبہ ہوا اور توبہ کی فکر ہوئی وہ ایک عالم کے پاس گیا اور استفتاء کیا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں میری توبہ قبول ہوسکتی ہے یا نہیں؟ وہ زاہد خشک تھا ننانوے خون کا نام سنتے ہی بگڑ گیا اور کہا کہ تیرے لیے توبہ نہیں ہے، سائل کو اس کے جواب پر غصہ آگیا اور تلوار سے اس کا بھی فیصلہ کیا کہ ۱۰۰ میں کسر کیوں رکھی ننانوے کا پھیر اچھا نہیں، لاؤ پورے سو ہی کردوں اس کے بعد کسی دوسرے عالم کے پاس گیا اور اُس سے جاکر کہا کہ میں نے ۱۰۰ خون کئے ہیں اور توبہ کرنا چاہتا ہوں میرے لیے توبہ ہے یا نہیں؟ اس عالم نے جواب دیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت بہت

وسیع ہے اور توبہ کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا تمہاری توبہ قبول ہو سکتی ہے مگر ایک شرط ہے کہ تم اپنی بستی سے فلاں بستی کی طرف ہجرت کر جاؤ شاید اس کی بستی کے لوگ اچھے نہ ہوں گے اس لیے عالم نے صحبت اشرار (۱) کے ترک اور صحبت اخیار (۲) کے اختیار کرنے کا مشورہ دیا تاکہ توبہ قائم رہ سکے ورنہ بدوں (۳) کی صحبت میں رہ کر توبہ پھر ٹوٹ جاتی چونکہ یہ شخص طالب بن چکا تھا اس لیے اس شرط کو منظور کر لیا اور اپنی بستی سے دوسری بستی کی طرف ہجرت کر کے چلا، تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ موت کا فرشتہ سامنے آ گیا ۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد　　روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد (۴)

جب موت سر پر آ گئی تو چلنے کی ہمت کہاں بے چارہ لیٹ گیا اور نزع کی حالت شروع ہو گئی مگر اس نے اس وقت بھی اپنا کام نہ چھوڑا نزع کی حالت میں بھی صلحاء کی بستی کی طرف گھسٹتا رہا اور اپنے سینہ کو اُدھر بڑھادیا اب رحمت حق کو جوش آیا زمین کو حکم ہوا کہ اس شخص کی بستی دور ہو جائے اور صلحاء کی بستی قریب ہو جائے چنانچہ زمین کی طنابیں کھنچ گئیں اور صلحاء کی بستی ایک ہاتھ قریب اور اشرار کی بستی ایک ہاتھ دور ہو گئی۔ جب اس کی روح پرواز ہو گئی تو ملائکہ رحمت و ملائکہ عذاب دونوں آئے اور باہم جھگڑنے لگے ملائکہ رحمت نے کہا کہ اس کی روح کو ہم لے جائیں گے کیونکہ یہ توبہ کر کے اللہ کے راستہ میں نکل چکا ہے: { وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ } (۵) ملائکہ عذاب نے کہا کہ اس کی توبہ کی تکمیل کے لیے صلحاء کی بستی میں پہنچنا شرط تھا اور شرط نہیں پائی گئی اس لیے یہ جہنمی ہے اور اس کی روح کو ہم لیں گے، یہاں سے معلوم ہوا کہ ملائکہ بھی اجتہاد کرتے ہیں اور مسائل اجتہادیہ میں ان کے درمیان بھی اختلاف و نزاع ہوتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجذوبین بھی اجتہاد کرتے ہیں اور ان میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے کیونکہ مجذوبین کی شان

(۱) برے لوگوں کی صحبت (۲) اچھے لوگوں کی صحبت (۳) بروں (۴) ''افسوس چشم زدن ہی میں صحبت یار ختم ہو گئی، ہم گل کی سیر بھی کرنے نہ پائے تھے سبز موسم بہار ختم ہو گیا'' (۵) ''اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی غرض سے نکلے پھر اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کا اجر اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذمہ ہے'' سورۃ النساء: ۴/ ۱۰۰۔

مثل ملائکہ کے ہے بہر حال حق تعالیٰ نے اس اختلاف کا یوں فیصلہ کیا کہ ایک فرشتہ کو بھیجا کہ ان دونوں جماعتوں سے کہہ دو کہ دونوں بستیوں کی مسافت کی پیمائش کریں اگر یہ صلحاء کی بستی سے قریب ہو تو جنتی ہے اور ملائکہ رحمت اس کو لے جائیں اور اگر اشرار کی بستی سے قریب ہے تو جہنمی ہے اور ملائکہ عذاب اس کو لے جائیں وہ اس کے مستحق ہیں زمین کی پیمائش کی گئی تو یہ شخص بقدر سینہ بڑھا دینے کے صلحاء کی بستی سے قریب تھا کیونکہ اس کا سامان تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے ہی کر دیا تھا بس ملائکہ رحمت اس کو لے گئے۔ سچ ہے

رحمتِ حق بہانہ می جوید رحمت حق بہا نمی جوید (۱)

اے مسلمانو! حق تعالیٰ کی رحمت سے تو یہ امید ہے کہ جنت میں تو ان شاء اللہ پہنچ ہی جاؤ گے (۲) مگر پھر بھی اعمال سے بے فکری نہ کرو۔

اثر خوف ورجا

واقعی حق تعالیٰ ذرا سی بات پر رحمت فرما دیتے ہیں اور ذرا سی بات پر رحمت تو ہوتی ہے مگر عذاب کبھی ذرا سی بات پر نہیں ہوتا بلکہ عذاب جب ہوتا ہے بہت ہی بڑی بات پر ہوتا ہے کیونکہ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (سبقت رحمتی علی غضبی) (۳) ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ یہ شخص اس کو ذرا سی بات سمجھے اور واقع میں وہ ذرا سی بات نہ ہو بلکہ سنگین ہو اس لیے ہم کو تو رحمت ہی کی زیادہ امید کرنی چاہیے مگر یاد رکھو کہ امید ورجا وہی ہے جو عمل کر کے کی جائے اور جو بدونِ عمل کے ہو رجا نہیں بلکہ محض تمنا اور غرور ہے اس کے بعد ارشاد ہے: وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ کہ یہ خبر بھی دیدیجئے کہ میرا عذاب بھی بہت سخت ہے یہ تکمیل ترغیب کے لیے بڑھایا گیا ہے کیونکہ یہ ترغیب کی تکمیل ترہیب سے ہوتی

(۱) "اللہ کی رحمت بہانہ ڈھونڈتی ہے، رحمت حق قیمت طلب نہیں کرتی" (۲) سامعین وعظ کے لیے یہ بشارت سب سے پہلے ہے کیونکہ اول مخاطب وہی ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوب بندوں کی بات کو غلط نہیں کرتے لو اقسم احد منهم علی اللّٰه لا برہ فطوبی لنا ثم بشری لنا اللهم فصدق لنا ظننا بولیک وحقق رجاءنا ببرکة مجدد شرع نبیک علیه افضل الصلوة وابهی السلام الی یوم القیام (۱۲ ظفر) (۳) "میری رحمت میرے غضب سے بڑھکر ہے" اتحاف السادة المتقین: ۸/ ۵۵۶، الدرر المنتثرہ/ ۹۷۔

ہے جیسا کہ ترہیب کی تکمیل ترغیب سے ہوتی ہے بدون ایک دوسرے کے ہر ایک ناقص ہے کیونکہ رجا احتمال نفع ہے(۱) اور احتمال کا مفہوم خود مستلزم ہو رہا ہے دوسرے احتمال کو اسی طرح خوف احتمال ضرر ہے اور اسی طرح یہ بھی مستلزم ہو رہا ہے دوسرے احتمال کو پس کسی کا تحقق بدون دوسرے کے نہیں ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ترغیب وترہیب دوش بدوش (۲) چلتے ہیں پس خوف ورجاء ہی سے مل کر ایمان کامل ہوتا ہے اس لیے مومن کو خوف کے ساتھ رجاء اور رجاء کے ساتھ خوف کا ملانا ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اگر حشر میں یہ ندا ہو کہ جنت میں ایک ہی آدمی جائے گا لرجوت انی اکون تو میں یہ سمجھوں گا کہ وہ ایک میں ہی ہوں اور اگر یہ ندا ہو کہ جہنم میں ایک ہی جائے گا لخفت انی اکون تو میں ڈروں گا کہ شاید وہ ایک میں ہی نہ ہوں گویا رجاء وخوف دونوں کامل درجہ کے تھے، بس یہی حاصل ہے آیت کا کہ بندوں کو رغبت ورہبت دونوں جمع کرنا چاہئیں یہ تو مقصود تھا جو ختم ہو گیا۔

مغفرت ورحمت حق

اب ایک بات زائد از مقصود اور رہ گئی جو تفسیر کے متعلق ہے بلکہ دو، ایک طلبۃ العلم کے لیے ایک طلبۃ العمل کے لیے یعنی ذاکرین کے لیے کیونکہ یہ لوگ عمل کے طالب ہیں جو بات طلبۃ العمل کے لیے ہے وہ تو یہ ہے کہ اس آیت کے بعد دو قصے مذکور ہیں ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جس میں ان کے لیے بڑھاپے کی حالت میں بشارت ولد مذکور ہے۔ دوسرا قصہ قوم لوط کا ہے جس میں ان پر نزولِ عذاب کا ذکر ہے تو ان قصوں کو اس آیت سے کیا ربط ہے میرے نزدیک ان دونوں قصوں میں نَبِّئْ عِبَادِيٓ اَنِّيٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ کی تائید ہے۔ پہلے جزو سے پہلے قصہ کو تعلق ہے اور دوسرے جزو سے دوسرے قصہ کو جس میں بتلایا گیا ہے کہ جب اعمال صالحہ پر ہماری رحمت اور اعمال سیئہ پر ہمارا عذاب دنیا میں بھی آجاتا ہے، جو کہ دار الجزاء نہیں بلکہ دار العمل ہے تو آخرت میں تو ان کا ظہور کیوں نہ ہوگا جو کہ دار الجزاء ہے اگر حق تعالیٰ آخرت میں کسی کو عذاب نہ فرماتے تو دنیا میں بدرجہ اولیٰ کسی پر بھی عذاب نہ آتا

(۱) امید میں نفع کا احتمال ہے اور احتمال ہونے سے یہ لازم آتا ہے کہ دوسری جانب کا بھی احتمال ہے(۲) شانہ بشانہ۔

کیونکہ یہ دار الجزاء نہیں جب یہاں بھی بعض دفعہ بوجہ اعمال سیئہ کے عذاب آتا ہے تو سمجھ لو کہ آخرت میں تو اس کا ظہور ضرور ہی ہوگا پس رحمت کی وسعت وسبقت کو سن کر عذاب سے بے فکر ہرگز نہ ہونا اور عذاب کی شدت سن کر رحمت سے بھی مایوس نہ ہونا کیونکہ حق تعالیٰ دنیا میں بھی بعض دفعہ ایسی حالت میں رحمت فرماتے ہیں جب کہ اسباب ظاہرہ سے اس کی اُمید کچھ نہیں رہتی جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حالت اُمید اولاد سے بعید ہوگئی تھی اسی طرح قوم لوط کی ظاہری حالت عیش وعشرت نے ان کو احتمال عذاب سے بے فکر کردیا تھا (سبحان اللہ کیا خوب ربط ہے فللّٰہ درہ)۔

دوسرا نکتہ طلبۃ العلم کے لیے یہ ہے کہ اَنَّ عَذَابِیْ ھُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ میں حق تعالیٰ نے طرز عنوان کو بدل دیا ہے کہ انی انا المعذب العظیم نہیں فرمایا یعنی صفت تعذیب کو اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا جیسا کہ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ میں مغفرت ورحمت کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، میرے نزدیک اس میں سبقت رحمتی علی غضبی (میری رحمت میرے غصہ پر غالب آگئی) کا مضمون مخفی ہے جو حدیث میں تو ظاہر ہے مگر قرآن میں مخفی ہے جیسا عنقریب اُس کی تقریر آتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ باطن بھی ہیں ان کے کلام میں صفت باطن کی بھی رعایت ہے جیسا کہ پہلی آیت میں اسی صفت رحمت پر دلالت کرنے میں ظاہر کی رعایت ہے۔ اسی لیے قرآن مجید سے اہل ظاہر وباطن سب کو حظ آتا ہے (۱) گو اہل باطن کو زیادہ حظ آتا ہے اسی کو کسی نے یوں کہا ہے ؎

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ می دارد   برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را (۲)

اس شعر کی لفظی تحقیق کرتے ہوئے فرمایا کہ اس میں لفظ معنی بکسر ماقبل الیاء ہے اہل فارس کا یہی طرز ہے کہ وہ اسم مقصور کو بکسر ماقبل الیاء پڑھتے ہیں چنانچہ حضرت موسیٰ وعیسیٰ کو بھی مُوْسِی اور عِیْسِی کہتے ہیں اسی طرح لیلیٰ کو لیلِی پڑھتے ہیں جیسا کہ اس شعر میں ہے ؎

گفت مشق نام لیلِی می کنم!   خاطر خود را تسلی می کنم (۳)

اس میں لیلیٰ بکسر لام ہے۔ بقرینہ تسلی کے اگر لیلا پڑھا جائے تو تسلی کو تسلاّ

(۱) لذت آتی ہے (۲) "اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل وجان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل وجان کو بو سے تازہ رکھتی ہے" (۳) "کہا کہ اپنی محبوبہ لیلیٰ کے نام کی مشق کررہا ہوں اپنے دل کو تسلی دیتا ہوں"۔

پڑھنا پڑے گا۔ غرض اللہ تبارک وتعالیٰ نے مغفرت ورحمت کا بیان تو اس طرح فرمایا کہ میرے بندوں سے کہہ دو کہ میں بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہوں اور عذاب کی نسبت یوں نہیں فرمایا کہ میں بہت عذاب کرنے والا ہوں بلکہ یوں فرماتے ہیں کہ میرا عذاب بہت سخت ہے، میری سزا بہت دردناک ہے اس میں تعذیب کو اپنی صفت کے صیغہ کے طور پر نہیں فرمایا تو اس میں سبقت رحمتی علی غضبی پر دلالت ہے کہ رحمت چونکہ سابق ہے اس لیے صفت کے رنگ میں مذکور ہوئی اور غضب صفت کے رنگ میں مذکور نہیں ہوا یہ نکتہ تو میرے ذہن میں اس آیت کے الفاظ پر غور کرکے اوّل ہی وہلہ (۱) میں آ گیا تھا اس کے بعد ایک دوسرے مضمون کی طرف ذہن منتقل ہوا وہ بہت عجیب ہے۔

فرق فعل اور صفت

وہ یہ کہ حق تعالیٰ کے لیے ایک تو افعال ہیں اور ایک صفات ہیں اور ظاہر ہے کہ صفات کا قرب بہ نسبت افعال کے ذات سے زیادہ ہے کیونکہ صفات لاعین لاغیر ہیں اور افعال اتفاقاً غیر ذات ہیں اس لیے افعال کو بہ نسبت صفت کے ذات سے بعد ہے اور اسماء الٰہیہ میں بعض اسماء تو صفات پر دال ہیں اور بعض اسماء افعال پر دال ہیں پھر آج میں نے بہت غور کیا تو اسماء الٰہیہ میں کوئی نام ایسا نہیں پایا جو مرتبہ صفت میں غضب پر دال ہو بہت سے بہت آپ قہار وجبار کو پیش کریں گے تو جبار کے معنی تو غضب کے نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی جو صفت جبار ہے وہ جبر کسر کے معنی میں سے ہے جس کا حاصل ہے تلافی کرنا شکستگی کو جوڑنا تو اس کی دلالت تو خود رحمت ہی پر ہے اور قہار میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ اسم فعلی ہو جو فعل پر دال ہو اسم وصفی نہ ہو جیسے محیی ومميت وخالق ورازق ہے تو اس صورت میں تو شبہ ہی نہیں ہوسکتا دوسرا احتمال یہ ہے کہ اسم صفت ہو مگر لغت عربی میں قہر کے معنی غصہ وغضب کے ثابت نہیں بلکہ غلبہ کے معنی ہیں پس یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غضب حق تعالیٰ کی صفت ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ حق تعالیٰ سے صدور غضب نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے لیکن درجہ فعل میں ہوتا ہے نہ کہ درجہ صفت میں اور رحمت کا ثبوت درجہ صفت میں ہوتا ہے جو کہ قدیم ہے اور اسی قدوم کے سبب صفت وموصوف کے

(۱) شروع ہی میں آ گیا تھا۔

تعلق میں ارادہ کو دخل نہیں کیونکہ لازم ذات ملزوم میں تخلل جعل نہیں ہوا کرتا گو رحمت کا تعلق عباد سے تو بالارادہ ہی ہوگا مگر ذات کی طرف اُس کا انتساب (۱) بلا ارادہ ہے اور غضب کا انتساب بھی ذاتِ حق کی طرف بالارادہ ہے اور یہ ایک دوسری توجیہ ہے سبقت رحمتي علی غضبي کی کہ رحمت کو غضب پر سبقت بہ ایں معنی ہے کہ وہ صفت ہے اور یہ فعل ہے اور صفت سابق ہوتی ہے فعل پر یہی وجہ ہے کہ رحمت تو بلا سبب بھی ہوجاتی ہے کیونکہ مقتضیٰ ذات کا ہے اور غضب بلا سبب نہیں ہوتا اور ایک توجیہ سبقت رحمتي علی غضبي کی وہ ہے جو میں نے استاد رحمہ اللہ سے سنی ہے کہ جس شخص میں مقتضیات رحمت وغضب دونوں مجتمع ہوں اُس پر رحمت ہوتی ہے اور ایک صورت سبق کی یہ ہے کہ اعمال حسنہ میں تضاعف ہوتا ہے کہ ایک حسنہ کو دس حسنات کے برابر کردیا جاتا ہے اور بعض کے لیے ایک حسنہ کو سات سو حسنہ تک اور بعض حسنات کو الی مالا یتناھی بمعنی لا تقف عند حد (۲) بڑھایا جاتا ہے چنانچہ صوم کے بارے میں بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس کے ثواب کا تضاعف مالا نہایۃ بمعنی لا تقف عند حد تک ہوتا ہے اور اعمال سیۂ میں تضاعف (۳) نہیں ہوتا بلکہ ہر گناہ ایک ہی گناہ شمار ہوتا ہے یہ توجیہ بھی لطیف ہے (مگر آج کی توجیہ الطف واشرف ہے ۱۲ ظ) اور اس سے معلوم ہوا کہ رجاء وخوف میں رجاء اصل ہے کیونکہ اس کا تعلق رحمت سے ہے جو صفت حق ہے اور خوف اصل نہیں اس کا تعلق غضب سے ہے جو صفت نہیں بلکہ فعل ہے اور ظاہر ہے کہ صفت بمقابلہ فعل کے اصل ہے اس لیے لازم ہے کہ ان دونوں کی فروع میں بھی جو شئے فرع صفت کی ہے وہ اصل ہو اور جو غضب کی فرع ہے وہ اصل نہ ہو پس رجاء وخوف کی ایسی مثال ہے جیسے غذا و دواء، کہ غذا اصل ہے اور دوا عارض پس رجاء غذا ہے اور خوف دوا ہے۔

خوف کی حد

دوسری وجہ اصالت وترجیح رجاء کی یہ ہے کہ طریق جنت کا مدار عمل پر ہے اور رجاء سے نشاط پیدا ہوتا ہے اور نشاط موجب ازدیادِ عمل ہے (۴) اور خوف سے انقباض

(۱) ذات کی طرف منسوب کرنا (۲) لا انتہا بڑھاتے ہیں کہ اس کی انتہاء کی کوئی حد نہیں ہوتی (۳) گناہوں کو بڑھایا نہیں جاتا (۴) امید سے طبیعت میں فرحت ہوتی ہے جس سے عمل میں زیادتی ہوتی ہے۔

ہوتا ہے اور انقباض موجب تقلیل عمل (۱) ہے گو اصل متعلق خوف کا اعمال سیئہ ہیں جس کا مقتضی یہ تھا کہ خوف سے صرف اعمال سیئہ کی تقلیل ہوا کرتی مگر تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ غلبہ خوف سے جبکہ وہ مفرط (۲) ہو جاوے اعمال صالحہ میں بھی تقلیل کا اندیشہ ہو جاتا ہے بلکہ تقلیل کا وقوع ہو جاتا ہے (۳) تو جو چیز تقلیل عمل کی طرف مفضی ہو سکے وہ اصل نہیں ہو سکتی، اسی لیے حضور ﷺ نے رجاء (۴) کے لیے کوئی حد بیان نہیں فرمائی اور خوف کے لیے حد بیان فرمائی ہے جو ابھی آتی ہے اور یہی کافی دلیل ہے حضور ﷺ کے اعقل الناس ورئیس الحکماء والعقلاء (۵) ہونے کی کیونکہ آپ نے جو خوف کی حد بیان فرمائی ہے وہ کسی عاقل کے کلام میں نہیں مل سکتی (الا ان یکون نبیا مثلہ) آپ فرماتے ہیں واسئلک من خشیتک ما تحول بہ بینی وبین معاصیک (۶) یہ حد آپ نے اس لیے بیان کی ہے کہ غلبہ خوف سے تعطل کا اندیشہ ہے (۷) ہم نے تجربہ کیا ہے کہ زیادہ خوف سے مایوسی ہو جاتی ہے کانپور میں ایک وکیل میرے ہم نام تھے انہوں نے احیاء العلوم کا باب الخوف دیکھا تھا ان کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ خاتمہ بالخیر ہونے سے مایوس ہو چلے اور اس کا نام سن کر تھراتے اور کانپتے تھے ایک دن وہ میرے پاس کتاب لے کر آئے اور حالت یہ تھی کہ کتاب کو کھولتے ہوئے ان کا ہاتھ کانپتا تھا آخر میں نے تسلی کی جب کچھ ان کے ہوش وحواس درست ہوئے اور مجھ سے میری اس تقریر کے ضبط کرنے کی درخواست کی چنانچہ وہ ضبط اور شائع ہو چکی اس کا نام "خاتمہ بالخیر" ہے اسی طرح ایک انسپکٹر پولیس پر خوف غالب ہو گیا تھا اور وہ اس غلبہ سے اپنی مغفرت سے مایوس تھا آخر کہنے لگا کہ میں دوزخ میں ضرور جاؤں گا، پھر ظلم ورشوت میں بھی کیوں کمی کروں مگر نہ معلوم حق تعالیٰ کو اس کا کون سا فعل پسند آ گیا ہوگا کہ آخر میں توبہ نصیب ہوئی اور خاتمہ اچھا ہو گیا۔

---

(۱) خوف سے دل گھٹتا ہے جس سے عمل میں کمی واقع ہوتی ہے (۲) حالت خوف جب حد سے بڑھ جائے (۳) خوف کی زیادتی سے اعمال صالحہ میں کمی ہو جاتی ہے (۴) اشکال نہ کیا جائے کہ حضور نے شوق کے لیے تو حد بیان فرمائی واسئلک شوقا الی لقاءک فی غیر ضراء مضرۃ ولا فتنۃ مضلۃ جواب یہ ہے کہ شوق ورجاء ایک چیز نہیں دونوں کی حقیقت جدا ہے جیسا کہ علم تصوف سے ظاہر ہے ۱۲ ظ (۵) "اے اللہ! میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں جس سے گناہوں میں آڑ ہو جائے" لم اجد الحدیث فی موسوعۃ إطراف الحدیث النبوی الشریف (۶) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب انسانوں سے زیادہ عقل مند تھے بلکہ سارے حکماء وعقلاء کے سردار تھے (۷) بیکار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

افراطِ خوف کا اثر

تو حضرت بعض دفعہ غلبہ خوف سے یہ حالت ہوجاتی ہے کہ انسان سمجھ لیتا ہے کہ میری بخشش تو ہو نہیں سکتی یقیناً میں جہنم میں جاؤں گا پھر گناہوں میں کمی کیوں کروں۔ جیسے ایک دیہاتی نے کہا تھا" پڑھن تو مرن نہ پڑھن تو مرن پھر دانتا کر کر کیوں کرن" یعنی پڑھ کر بھی ایک دن مریں گے اور بے پڑھے بھی مریں گے پھر کس لیے پڑھنے میں محنت کریں غرض چونکہ خوف کا افراط مضر تھا (۱) اس لیے اس کو محدود کیا گیا اور رجاء کے لیے کوئی حد نہیں کیونکہ یہ اندیشہ تو ہے ہی نہیں کہ غلبہ رجا سے پیغمبر ہوجائے گا جیسے ایک دیہاتی نے میاں جی سے کہا تھا کہ میرے لونڈے کو ڈھیر نہ پڑھائیو کہیں لوٹ پوٹ پگمبر (پیغمبر) ہوجائے تو یہاں یہ اندیشہ نہیں اس لیے بزرگوں نے خوف کا نام سوط (۲) رکھا ہے اور ظاہر ہے کہ کوڑا اصل مقصود نہیں ہوتا بلکہ ضرورت کے وقت بقدر ضرورت استعمال کیا جاتا ہے اسی لیے خوف مانع عن المعاصی قبل الموت (۳) تک مطلوب ہے جب تک کہ عمل ہوسکے اور موت کے وقت انقطاع عمل ہے وہ خوف مطلوب نہیں بلکہ اُس وقت غلبہ رجا مطلوب ہے چنانچہ حدیث میں ہے لا یموتن احد کم الا وھو یحسن الظن باللہ تعالٰی او کماقال۔ (۴) شاید اس جگہ کسی کو شبہ ہو کہ بعض دفعہ غلبہ رجا سے دلیری و بیباکی پیدا ہوجاتی ہے تو اس کے لیے بھی ایک حد ہوئی کہ رجا اس حد تک مطلوب ہے جس سے دلیری و بے باکی پیدا نہ ہو اس کا جواب یہ ہے کہ جس چیز سے دلیری و بے باکی پیدا ہوتی ہے وہ رجاء نہیں ہے کیونکہ میں اوپر وَاَنَّ عَذَابِیۡ ھُوَ الۡعَذَابُ الۡاَلِیۡمُ کے ذرا قبل کہہ چکا ہوں کہ رجا بدون عمل کے نہیں ہوتی بلکہ وہ تمنا و غرور ہے پس رجاء کے لیے حد ثابت نہ ہوئی۔

اب سنئے شیوخ میں اس مسئلہ کی بابت اختلاف ہوا ہے کہ غلبہ رجا انفع ہے یا غلبہ خوف (۵) بعض نے اول کو انفع کہا بعض نے ثانی (۶) کو اور ہر ایک نے اس پر دلائل

(۱) خوف کی زیادتی نقصان دہ تھی (۲) کوڑا (۳) ایسا خوف جس سے گناہ کرنے سے رک جائے وہ موت سے پہلے پہلے مطلوب ہے جبکہ عمل کرسکتا ہے اور جب عمل کے قابل نہ رہے اور موت آئے تو رجاء اور امید مطلوب ہے (۴) سنن ابن ماجہ: ۴۱۶۷، مسند احمد: ۲۹۳۳، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۶۰۵ (۵) غلبہ خوف سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے یا غلبہ امید ہے (۶) بعض نے پہلے کو بعض نے دوسرے کو مفید بتایا۔

قائم کئے ہیں الحمد للہ مجھے اس میں فیصلہ منکشف ہوگیا ہے وہ یہ کہ جن لوگوں میں اعمال صالحہ کا غلبہ ہو کہ وہ زیادہ تر اعمال صالحہ میں مشغول ہیں اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام بھی کرتے ہیں گو کبھی کبھی ابتلا ہوجاتا ہے ان پر غلبہ رجا انفع ہے (۱) اور جن میں اعمال سیئہ (۲) کا غلبہ ہے کہ زیادہ تر اعمال سیئہ میں مبتلا ہیں اور اعمال صالحہ قلیل ہیں اُن کے لیے غلبہ خوف انفع ہے (۳) جب تک کہ اعمال صالحہ کا غلبہ ہو پس جب تک اعمال صالحہ کا غلبہ نہ ہو اس وقت تک غلبہ خوف ہی میں اس کو رکھا جائے گا چاہے کچھ دنوں کے لیے خوف رجا پر بھی غالب ہوجائے اور اگر اس کو یہ معلوم ہو کہ میرے اندر رجا نہیں اس کی پرواہ نہ کی جائے گی جیسے بعض دفعہ طبیب دوا کو غذا پر غالب کرتا ہے اور اسقاطِ حمل (۴) میں تو غذا بالکل بند کردی جاتی ہے اس کے بعد پھر رجا کو غالب کیا جائے گا میں یہ بات شیوخ کو بتلا رہا ہوں جو مربی ہیں کہ وہ اپنے مربوں کے ساتھ کس طرح برتاؤ کریں۔ اور یہ یاد رکھو کہ غلبہ رجا کی حالت میں خوف بھی رہتا ہے مگر غلبہ خوف کو نہیں ہوتا یعنی وہ درجہ نہیں ہوتا جس کو عام لوگ خوف سمجھتے ہیں۔

خوف کی حقیقت

یہ میں نے اس واسطے کہا ہے کہ بعض لوگوں کو غلبہ رجا کی حالت میں یہ دھوکہ ہوجاتا ہے کہ ہم میں خوف نہیں ہے اور وہ غلبہ خوف کے نہ ہونے سے یہ سمجھتے ہیں کہ سرے سے خوف ہی نہیں ایسے لوگوں کے جواب میں میرا طریقہ یہ ہے کہ اوّل اُن سے سوال کرتا ہوں کہ تمہارے نزدیک خوف کے کیا معنی ہیں میں شروع ہی میں حقیقت کو ان پر واضح نہیں کرتا کیونکہ اس کی قدر نہیں ہوتی شیوخ اس کو بھی سن لیں کہ تعلیم کا طریقہ یہ ہے اس سے مخاطب کو قوت مطالعہ حاصل ہوتی ہے پھر وہ حقیقت کو خود ہی سمجھ لیتا ہے تمہاری تقلید پر نہیں رہتا تو میں اول ان سے ہی پوچھتا ہوں کہ خوف کی حقیقت کیا ہے اب وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارا دل وعظ کو سن کر نہیں تھراتا آنسو نہیں نکلتے اس پر میں یہ کہتا ہوں کہ کیا یہ امور اختیاری ہیں جواب آتا ہے کہ نہیں اختیاری تو نہیں پھر میں لکھتا

(۱) امید زیادہ نافع ہے (۲) گناہوں کے اعمال (۳) غلبہ خوف زیادہ مفید ہے (۴) حمل ضائع ہونے کی صورت میں۔

ہوں کہ خوف مامور بہ ہے (۱) اور غیر اختیاری شئے مامور بہ نہیں ہو سکتی (۲) معلوم ہوا کہ جس کو تم خوف سمجھتے ہو وہ خوف ہی نہیں اب وہ سوال کرتے ہیں کہ پھر خوف مامور بہ کی حقیقت کیا ہے اب میں ان کے سامنے حقیقت کو واضح کرتا ہوں جبکہ وہ یہ تسلیم کر چکے کہ جس شے کو ہم نے خوف سمجھا تھا وہ خوف نہیں ہے اور ہم نے اس کو خوف سمجھنے میں غلطی کی، اس کے بعد میں بتلاتا ہوں کہ خوف کی حقیقت ہے احتمالِ عذاب کہ انسان کو اپنے متعلق یہ احتمال ہو کہ شاید مجھے عذاب ہو اور یہ احتمال مسلمانوں میں ہر شخص کو ہے اور یہی مامور بہ ہے (۳) اسی کا بندہ کو مکلف کیا گیا ہے اس کا نام خوف عقلی ہے اور اس کے مقابل رجا کی حقیقت ہے احتمال نجات میں ایسا کوئی مسلمان نہیں جس کو اپنے متعلق نجات کا احتمال نہ ہو پس ایسا کوئی مسلمان نہیں جو خوف ورجاء کے درجہ مامور بہ (۴) سے خالی ہو بلکہ سب اصحاب خوف ورجا ہیں (۵) اور یہی درجہ خوف ورجاء کا جزو ایمان ہے اور یہ درحقیقت عقائد میں سے ہے گو ایک معنی کو عقائد بھی اعمال ہیں یعنی اعمال قلب (۶) تو یہ عقیدہ ہر مسلمان کا ہے کہ جس کے متعلق وحی نازل نہ ہوئی ہو اس میں دونوں احتمال ہیں عذاب کا بھی اور نجات کا بھی۔ گو احتمال کے درجات مختلف ہیں کسی میں احتمال نجات غالب اور احتمال عذاب موہوم ہے کسی میں برعکس اور کسی میں دونوں احتمال برابر ہیں باقی نفس احتمال میں سب شریک ہیں تفاوت صرف درجات احتمال کا ہے یہ میں نے اس لیے کہا کہ کہیں تم خود کو اور حضرت غوث اعظم کو برابر نہ سمجھنے لگو کہ ان کے متعلق بھی دونوں احتمال ہیں اور ہمارے متعلق بھی کیونکہ میں نے بتلا دیا کہ احتمال تو واقعی دونوں میں دونوں باتوں کا ہے مگر درجات احتمال متفاوت ہیں (۷)۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی فراست

کان پور میں اس پر ایک قصہ ہو چکا وہاں ایک واعظ صاحب نے وعظ میں بلا ضرورت کہہ دیا کہ حضرت غوث اعظم کا جنتی ہونا یقینی نہیں بلکہ اُن میں احتمال جہنمی ہونے کا بھی ہے بس اس جملہ سے سارے شہر میں آگ لگ گئی ایک شخص مولوی صاحب

(۱) خوف خدا کا حکم ہے (۲) غیر اختیاری کام کا حکم نہیں دیا جاتا (۳) اس درجہ کا حکم ہے (۴) خوف ورجاء کے جس درجہ کا حکم ہے کوئی مسلمان اس سے خالی نہیں (۵) سب خوف ورجا والے ہیں (۶) عقائد دل کے اعمال ہیں (۷) درجات احتمال میں فرق ہے۔

کو لے کر مجھ سے استفتاء کرنے کو آیا میں بڑا پریشان ہوا کہ اس کی حقیقت لوگوں کو کس طرح سمجھاؤں جس سے فتنہ بھی فرو ہوجائے (۱) اور حقیقت بھی واضح ہوجائے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فوراً میری تائید کی کہ طریقہ تعلیم دل میں ڈال دیا میں نے اُس شخص سے کہا کہ کہئے آپ کیا فرماتے ہیں کہنے لگے ہمارا اعتقاد تو یہ ہے کہ حضرت غوث اعظم یقینی جنتی ہیں میں نے کہا بالکل ٹھیک کہتے ہو یہی اعتقاد چاہئے اگر وہ بھی جنتی نہ ہوں گے تو پھر ہم جیسوں کا کہاں ٹھکانا رہا، میرا یہ جواب سن کر مولوی صاحب بڑے حیران ہوئے کہ اس نے عوام کی موافقت اس غلط عقیدہ میں کیوں کر لی مگر عقل سے کام لیا کہ درمیان میں بولے نہیں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں نے اس شخص سے پوچھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کہا وہ بھی یقینا جنتی ہیں پھر میں نے کہا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جنتی ہونا کیسے معلوم ہوا کہا ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ جنتی ہیں میں نے کہا جزاک اللہ، اب یہ بتلاؤ کہ حضرت غوث اعظم کا جنتی ہونا کیسے معلوم ہوا کہا اُن کے متعلق بہت سے اولیاء کی شہادت ہے وہ بڑے ولی صاحب کرامات تھے، میں نے کہا ٹھیک کہتے ہو اچھا اب یہ بتلاؤ کہ حضور نبی اکرم ﷺ اور اولیاء میں کچھ فرق مراتب ہے یا نہیں؟ کہنے لگا ہاں صاحب زمین وآسمان کا فرق ہے میں نے کہا کیا ایسا ہی فرق دونوں شہادتوں میں بھی ہے۔ بولا ہاں میں نے کہا کیا ایسا فرق ان دونوں شہادتوں کے اثر میں بھی ہے بولا ہاں، میں نے کہا کیا ایسا ہی فرق دونوں کے یقینا جنتی ہونے میں بھی ہے، کہنے لگے ہاں ضرور ہے میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ مولانا یہ بھی اس یقین کے معتقد نہیں جس کی آپ نفی کرتے ہیں ورنہ یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت غوث اعظم کے جنتی ہونے میں فرق نہ کرتے۔

جنسِ ایمان

بات یہ ہے کہ عوام ظن کو بھی یقین ہی سے تعبیر کرتے ہیں وہ تعبیر میں ظن ویقین کے اندر فرق نہیں کرتے غرض عوام بھی بجز اُن حضرات کے جن کا قطعی جنتی ہونا نص سے معلوم ہے کسی ولی کو قطعی اور یقینی جنتی نہیں سمجھتے لیکن ان کے عرف میں یقین کا لفظ کبھی ظن کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے اسی لیے فقہاء نے کہا ہے کہ عالم کو اپنے اہل

(۱) فتنہ بھی ختم ہوجائے۔

زمانہ سے واقف ہونا چاہیے اور جو شخص اپنے زمانے والوں سے واقف نہیں وہ جاہل ہے۔ بہر حال خوف ورجاء سے کوئی خالی نہیں ہر شخص کو یہ احتمال بھی ہے کہ مجھے نجات ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ عذاب ہو، نفس احتمال میں سب برابر ہیں البتہ درجات احتمال مختلف ہیں اور یہی مطلب ہے امام صاحب کے قول ایمانی کایمان جبرئیل ولا اقول مثل ایمان جبرئیل یعنی نفس تصدیق میں سب مشترک ہیں امام صاحب نے درجات تصدیق میں مساوات کا دعویٰ کیا وہ تو اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لیے کاف بڑھا رہے ہیں کہ ایمانی کایمان جبرئیل اور مثل کی خود نفی فرما رہے ہیں مگر لوگ اس کاف پر نظر نہیں کرتے۔ بلا وجہ اُن کے مقلدین سے لام وکاف (۱) کرنے لگے، یہ ایک محاورہ ہے بمعنی جدال جو غالباً لکد وکوب کا مخفف ہے۔

جاہلانہ نکتہ

مگر ایک جاہل نے اس کو بہت بے موقع استعمال کیا ہے۔ اللہ بچائے ایسی جہالت سے، وہ بے موقع استعمال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ وحضرت خضر علیہ السلام کے قصے میں ایک تو قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ اِنَّكَ لَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ مَعِىَ صَبۡرًا (۲) وارد ہے۔ اور دوسری آیت میں قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكَ اِنَّكَ لَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ مَعِىَ صَبۡرًا ہے (۳)۔ علماء میں یہ سوال ہوا ہے کہ دوسری آیت میں "لک" کیوں بڑھایا گیا اس کی وجہ اہل بلاغت نے یہ بیان کی ہے کہ جواب سوال میں خفت ہو تو جواب میں بھی خفت کا لحاظ کیا جائے گا۔ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پہلا اعتراض خفیف تھا کہ ابتدائی تھا اس لیے حضرت خضر علیہ السلام نے بھی اس کا جواب تخفیف کے ساتھ دیا اور دوسرے اعتراض میں شدت تھی کیونکہ بعد ممانعت کے تھا اس لیے خضر علیہ السلام نے بھی جواب میں اسی کے مناسب قوت وشدت اختیار کی اور "لک" بڑھا دیا مگر ایک جاہل نے یہ نکتہ بیان کیا کہ دوبارہ "لک" اسی طرح بڑھایا گیا کہ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اس وقت ان دونوں میں لام وکاف ہونے لگا۔ نعوذ باللہ کہیں انبیاء میں بھی لام وکاف ہوا کرتا ہے ہرگز نہیں پس یہ نکتہ محض جاہلانہ ہے جو گستاخی پر مبنی ہے۔

(۱) جھگڑنے لگے (۲) سورۃ الکہف: ۱۸ / ۷۲ (۳) سورۃ الکہف: ۱۸ / ۷۵۔

درجہ اشتراک ودرجہ مساوات میں فرق

غرض امام صاحب نے تو کایمان جبرئیل میں کاف بڑھا کر بتلادیا کہ وہ مساوات کے قائل نہیں اسی لیے ولا اقول مثل ایمان جبرئیل بھی فرمارہے ہیں پس میں کایمان جبرئیل اور مثل ایمان جبرئیل کا فرق درجہ اشتراک ودرجہ مساوات سے تعبیر کرتا ہوں یعنی امام صاحب ایک درجہ میں اشتراک کے قائل ہیں اور وہ درجہ جنسیت ہے اور مساوات کی صراحتاً نفی فرمارہے ہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ جنس ایمان میں سب شریک ہیں اور نوع ہر ایک کے ایمان کی مختلف ہے یا یوں کہو کہ نوع میں اشتراک ہے مگر صنف ہر ایک کی جدا ہے اب امام صاحب کے اس قول کی ایسی مثال ہوگی جیسے یوں کہا جائے کہ ہم بھی ویسے ہی بشر ہیں جیسے رسول اللہ ﷺ بشر تھے تو کیا یہ قول مطلقاً غلط ہے ہرگز نہیں کیونکہ نص میں خود اس کی تصدیق موجود ہے قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۱) لیکن اگر اس سے محض نفسِ بشریت میں اشتراک مراد لیا جائے جب تو کلام صحیح ہے اور من کل الوجوہ مساوات (۲) کا دعویٰ کیا جائے تو کفر ہے (پس معترضین کو کیا حق ہے کہ وہ امام صاحب جیسے اورَع واتقیٰ کے کلام کو غلط محمل (۳) پر محمول کریں جب کہ اس کا صحیح محمل موجود ہے۔ یہ گفتگو درمیان میں استطراداً آ گئی تھی۔

شرط ایمان

میں یہ کہہ رہا تھا کہ جو درجہ خوف ورجاء کا شرط ایمان ہے وہ سب کو حاصل ہے اور جو درجہ کمال ایمان کی شرط ہے وہ مختلف ہے اس میں غوث اعظم اور تم مختلف ہو اور پہلے درجہ میں سب مشترک ہیں مگر لوگوں کو دھوکہ اس واسطے ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں درجوں میں فرق نہیں کرتے بلکہ جو درجہ خوف کا کاملین میں ہے اسی کو شرط ایمان سمجھتے ہیں اور ان کی حکایات وواقعات دیکھ کر اپنی حالت کا ان کی حالت سے موازنہ کرتے ہیں جب اپنے اندر ویسا خوف وہ نہیں پاتے جیسا کاملین میں تھا تو اب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم میں خوف ہی نہیں ہے اور

(۱) الکہف: ۱۸/ ۱۱۰ (۲) ہر اعتبار سے برابری کا دعویٰ کیا جائے (۳) امام صاحب جیسے متقی وپرہیزگار شخص کے کلام کو غلط محل پر محمول کریں۔

خوف شرط ایمان ہے اب ان کو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ ہم میں ایمان ہی نہیں سو میں نے بتلا دیا کہ جو خوف شرط ایمان ہے وہ بمعنی احتمال عقاب ہے[1] اور یہ ہر مسلمان کو حاصل ہے۔

نفس کی حقیقت

پس تم مطمئن رہو اور اپنے نفس کو کافر نہ کہو کیونکہ نفس کوئی دوسری چیز نہیں وہ تمہی تو ہو، تمہاری ہی ایک قوت کا نام نفس ناطقہ ہے اسی کا نام بعض کے نزدیک روح ہے اور وہ وہی ہے جس کو "تم" "میں" اور "ہم" سے تعبیر کرتے ہو بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نفس ہم سے جدا کوئی چیز ہے یہ غلط ہے اس کے متعلق ایک مشہور قصہ ہے کہ ایک صوفی نے نفس کو چھپکلی کی شکل میں دیکھا تھا پھر اس کو مار دیا یہ قصہ بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا اور صحیح بھی ہو تو اس نے نفس کی شہوت وحرص کو چھپکلی کی شکل میں دیکھا ہوگا اور اسی کو مارا بھی ہوگا ورنہ نفس کو مارنے کے بعد وہ خود بھی زندہ نہ رہتا، نیز جہلاء صوفیہ نے کہا ہے کہ نفس قبل از مجاہدہ کافر حربی ہے[2] اس درجہ میں اس کا نام "امارہ" ہے اور بعد مجاہدہ کے کافر ذمی[3] ہے اس درجہ میں اس کا نام "لوامہ" ہے اور جب مجاہدہ سے مستغنی ہوجائے اس وقت مسلمان ہوتا ہے اس کا نام مطمئنہ ہے یہ نام تو تینوں صحیح ہیں امارہ، لوامہ، مطمئنہ۔ محققین نے بھی نفس کی یہی تین قسمیں بیان کی ہیں مگر ان قسموں کو ان کے معانی کے ساتھ موصوف کرنا غلط ہے بحمد اللہ تعالیٰ ہمارا نفس تو مسلمان ہے امارہ بھی مسلمان ہے اور لوامہ بھی مسلمان اور مطمئنہ ہوجائے تو پھر ان جاہلوں کے نزدیک بھی مسلمان ہوگا۔

درجات خوف ورجاء

خلاصہ یہ ہوا کہ ایک خوف تو بمعنی احتمال عقلی عذاب ہے تو یہ شرط ایمان ہے اور ایک درجہ خوف کا یہ ہے کہ تقاضائے معصیت کے وقت آیات وعید اور عذاب خداوندی کو یاد کر کے سوچ سوچ کے گناہوں سے بچا جائے یہ درجہ فرض ہے اس کے فقدان سے کفر نہ ہوگا ہاں گناہ ہوگا اور ایک درجہ خوف کا یہ ہے کہ مراقبات واشغال سے

(۱) جو خوف ایمان کی شرط ہے وہ ایسا خوف ہے کہ جس میں سزا ہونے کا احتمال ہو (۲) وہ کافر جس سے جہاد کرنا جائز ہے (۳) وہ کافر جو جزیہ دیکر دارالاسلام میں رہتا ہے اس سے جہاد جائز نہیں۔

آیات وعید اور عظمت وجلال حق کو ہر دم مستحضر(۱) اور پیش نظر رکھا جائے یہ درجہ مستحب ہے اور یہ سب درجات مکتسب ہیں(۲) جو کسب سے حاصل ہوجاتے ہیں اور ان سے آگے ایک اور درجہ ہے جو اختیار سے باہر ہے وہ یہ کہ آثار خوف اس قدر غالب ہوجائیں کہ اگر ان کو کم کرنا یا بھلانا بھی چاہے تو ان کا کم کرنا اور بھلانا اس کے اختیار وقدرت سے باہر ہو یہ محض وہی ہے جو درجات سابقہ مکتسبہ کے حاصل کرنے کے بعد محض عطائے حق سے بعض کو حاصل ہوجاتا ہے اور ایسے ہی اس کے مقابلہ میں رجاء کے بھی درجات ہیں ایک درجہ شرط ایمان ہے بمعنی احتمال نجات، اور ایک درجہ فرض ہے، ایک مستحب ہے، اور ایک درجہ رجاء میں بھی ایسا ہے جو اختیار سے خارج ہے مکتسب نہیں بلکہ محض وہب سے بعض کو عطا ہوتا ہے اور گو رجاء وخوف کے ان اخیر درجات پر مقرب بننا موقوف نہیں مگر اکثر عطا ہوتا ہے، مقربین ہی کو اور اس میں بزرگوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں کسی میں غلبہ خوف کا ہے اور کسی میں غلبہ رجاء کا ہے کوئی زیادہ تر گریہ وزاری میں رہتا ہے کوئی زیادہ تر ہنسی خوشی میں رہتا ہے یہ سب الوان حضرت حق کے عطا کئے ہوئے ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان ست
بعند لیب چہ فرمودہ کہ نالان ست(۳)

غالب علی الاحوال

بعض اہل مقام ایسے بھی ہیں جو غالب علی الاحوال ہوتے ہیں کہ جس حالت پر چاہیں غلبہ حاصل کرلیں اور جس وقت جو حالت چاہیں اپنے اوپر وارد کرلیں ان کو ابوالوقت کہتے ہیں اور ایسے حضرات جو کبھی ایسا کرتے ہیں کہ اپنی اصلی حالت کے خلاف دوسری حالت اپنے اوپر وارد کرلیتے ہیں تو اس کا منشا کبھی تو اپنی ضرورت ہوتی ہے، کہ اس وقت اصلی حالت کا غلبہ کسی ضروری کام میں مخل ہے اس لیے وہ دوسری حالت کو اپنے اوپر غالب کرلیتے ہیں اور اس کی نظیر دنیوی معاملات میں بھی موجود ہے مثلاً ایک شخص کا بیٹا مرگیا جس سے طبیعت پر حزن وملال کا غلبہ ہے مگر اتفاق سے اُسی دن اس کو مقدمہ کی پیروی کے لیے عدالت میں جانا پڑگیا تو گو اس کی اصلی حالت رنج وملال کی ہے جس کا

(۱) مراقبات ومجاہدات کرکے اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال ہر وقت پیش نظر رہے(۲) یہ سب درجات انسان اپنے اختیار سے حاصل کرسکتا ہے(۳) ''پھول سے کیا فرمادیا کہ خنداں ہے بلبل سے کیا فرمادیا کہ نالاں ہے''۔

مقتضا یہ ہے کہ جواب دہی نہ کر سکے مگر اس وقت یہ شخص قصداً اپنے اوپر عقل کو غالب کرتا ہے اور رنج وملال کو مغلوب کر کے جواب دیتا ہے۔ اسی طرح عارف بھی کبھی اپنی کسی ضرورت کے وقت حالت اصلیہ کے خلاف دوسری حالت کو غالب کرلیتا ہے اور کبھی مرید کی مصلحت سے ایسا کرتا ہے کہ شیخ پر تو خوف کی تجلی غالب ہے مگر مرید کے لیے تجلی رجاء مفید ہے اس وقت شیخ اس مرید کی مصلحت سے اپنے اوپر تجلی رجاء کو غالب کرلیتا ہے۔ تا کہ اس کی طرف منتقل ہو اور دوسرے مرید کے لیے تجلی شوق مفید ہے اس کی مصلحت سے تجلی شوق کو اپنے اوپر غالب کرتا ہے وعلیٰ ہذا جس شخص کے لیے جس حالت کی تجلی نافع ہے شیخ اس کے سامنے اسی حالت کی تجلی اپنے اوپر وارد کرتا ہے یہ بے چارہ عجب کشمکش میں رہتا ہے جیسے کسی کی دو بیویاں ہوں اور ہر ایک اپنی طرف کھینچے مگر وہاں تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں کو دو گھروں میں رکھ دیا جائے مگر یہاں تو ایک ہی گھر ہے اور اسی میں یہ سب انقلابات ہوتے رہتے ہیں جن پر گزرتی ہے وہ جانتے ہیں کہ قلب کے اندر کتنا بڑا محکمہ ہے کہیں پھول پھلواری ہے کہیں خار ہے کہیں خزاں ہے کہیں بہار ہے اسی کو اہل حال ظاہر کرتے ہیں ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ دردل کشا بہ چمن درآ
اے برادر عقل یک دم باخود آر دم بدم در تو خزان ست وبہار(۱)

اور بعض کی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اندر اندر کیا ہورہا ہے وہ حیران و پریشان منہ تکتے رہ جاتے ہیں ان کی حالت اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

چنیں جاید وگہ ضد ایں جز کہ حیرانی نہ باشد کار دیں(۲)

ہیبت کا چرکہ

بعض دفعہ قدرت غیب سے ایسا ہوتا ہے کہ عارف پر ایک حال غالب ہے مگر اس کی مصلحت دوسرے حال کے غلبہ میں تھی تو اس وقت غیب سے مدد کی جاتی ہے کیونکہ یہ شخص مراد ہے اور مراد کی اصلاح حق تعالیٰ کی طرف سے بلا اس کے قصد کے ہوتی ہے

(۱) ''تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو۔ اے بھائی تھوڑی دیر کے لیے ذرا عقل کو درست کر کے دیکھو کہ خود بخود تمہارے اندر دمبدم خزاں وبہار موجود ہے''

(۲) ''کبھی کوئی امر ایک طرح معلوم ہوتا ہے اور کبھی دوسری طرح، دین کے کام میں حیرت کے سوا کچھ نہیں''۔

تو ایسی حالت میں بدون اس کے قصد کے دوسری حالت غالب کردی جاتی ہے اور اس وقت یہ ایسے محبوب کریم پر جان فدا کرنا چاہتا ہے مثلاً عارف پر اُنس کا غلبہ تھا (کاملین کے رجاء کو اُنس کہتے ہیں) اور اُنس کے بڑھنے سے خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں حدود سے باہر نہ ہوجائے تو دفعتاً کسی وقت ہیبت کا چرکہ لگا دیا جاتا ہے جس کے اول وُرود (۱) کے وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ جگر پھٹ جائے گا اس وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ میں بالکل معطل ہوجاؤں گا نہ بیوی کا رہوں گا نہ کھانے پینے کا نہ کسی کام کا مگر

دل فدائے او شد وجاں نیز ہم دردم از یار است ودرماں نیز ہم (۲)

پھر وہ سب کچھ کرتا ہے اور یہی غلبہ ہیبت کا چرکہ تھا جس سے رسول اللہ ﷺ کو ابتدائے نزولِ وحی کے وقت اپنی جان کا خطرہ ہوگیا تھا اور آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: انی اخاف علی نفسی واقعی حیرت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اعلم باللہ واتقی للہ ہوکر جن کے سامنے سب سے زیادہ مناظر ہیبت وجلال کے پیش نظر تھے آپ ہنستے بولتے اور مزاح کس طرح کرتے تھے مگر میں نے ابھی عرض کیا کہ عین غلبہ حال میں حق تعالیٰ کی امداد ساتھ ساتھ ہوتی ہے چنانچہ باوجودیکہ حضور ﷺ پر یہ سب حالات نہایت غلبہ کے ساتھ وارد تھے پھر بھی آپ معطل نہیں ہوئے بلکہ قدرت علی النکاح بھی آپ میں سب سے زیادہ تھی اور اس بات کو وہی عارف (۱) سمجھ سکتا ہے جس پر اس کی نظیریں وارد ہوتی ہیں اس وقت وہ سمجھتا ہے کہ مجھ پر بھی ایک حال ہیبت کا ایسا غالب ہوچکا ہے جس سے مجھے ہرگز اُمید نہ تھی کہ مجھ سے ان افعال کا صدور ہوسکے گا مگر پھر بھی سب افعال کا صدور ہوتا ہے اس وقت عارف کو توحید کا انکشاف تام ہوتا ہے کہ ایک ذات میرے اوپر ہے جو باوجود میرے ضعف کے پھر بھی مجھ سے سب کام لے رہے ہیں لوگ سمجھتے ہیں کہ کاملین بہت چین میں ہیں ان کو کوئی فکر نہیں ارے تم کو کیا خبر ہے کہ ان پر کیسے آرے چل رہے ہیں ـــ

(۱) پہلی مرتبہ اس خیال کے آنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل پھٹ جائے گا (۲) "درد محبوب کی طرف سے ہے اور اس کا علاج ان ہی کی جانب سے اس پر دل بھی قربان ہے اور جان بھی" (۱) افسوس بعض اہل ظاہر نے بدون سمجھے ہوئے حضور کے قول انی اخاف علی نفسی کو جو آپ نے ابتدائے نزول وحی میں حضرت خدیجہؓ سے فرمایا تھا بہت بعید محامل پر محمول کیا ہے جو بالکل غلط ہے، چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند ۱۲ ظفر۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند (۳)

حضرت ان کے اندر ایک بڑا گودام ہے جس میں کبھی نار (۱) کا غلبہ ہے کبھی آب کا (۲)، کبھی بھاپ کی ضرورت ہے کبھی اسٹیم بند کرنے کی، ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کو حالات کے تواتر سے پریشانی زیادہ نہیں ہوتی بلکہ پریشانی میں بھی لذت آتی ہے مگر تمہارے خیال کے موافق وہ بےفکر نہیں ہیں بس اب میں ختم چاہتا ہوں۔

خلاصہ بیان

خلاصہ بیان یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے خوف ورجاء کی ضرورت کو بیان فرمایا ہے جس کے یہ درجات ہیں جو اجمالاً مذکور ہوئے اور جب عمل کرو گے تو ان کا انکشاف زیادہ ہوگا پس حق تعالیٰ حضور ﷺ کے واسطے سے ہم کو مطلع فرماتے ہیں کہ میں غفور رحیم ہوں اور میرا عذاب بھی سخت ہے اور جب اس کا انکشاف ہوگا اُس وقت ہر ایک کو اپنے درجہ کے موافق اس سے حظ (۱) حاصل ہوگا منتہی کو بھی اور مبتدی کو بھی کم از کم یہ بات تو سب کو حاصل ہوجائے گی کہ گناہوں سے رکاوٹ ہوگی، اب ہم کو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اصل مضمون تو سہل ہی ہے گو آخیر میں کچھ دقیق ہوگیا مگر یہ دقت وغموض مقدمات ومبادی میں ہے اصل مقصود نہایت سہل وآسان ہے اور چونکہ اس بیان میں غلبہ رجاء کا بیان زیادہ ہے اس لیے میں اس کا نام جمال الجلیل رکھتا ہوں گو جلال الجمیل بھی نام ہوسکتا تھا مگر غلبہ رجا کے مناسب پہلا نام ہے اس لیے وہی اولیٰ ہے اب دُعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو توفیقِ عمل عطا فرمائیں۔

وصلی اللّٰہ تعالی علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

---

(۳) "اے وہ شخص تیرے پاؤں میں ابھی کانٹا بھی نہیں چبھا تجھے ان شیروں کی کیا خبر جن کے سروں پر بلا کی تلواریں چل رہی ہیں" (۱) آگ (۲) پانی (۱) لطف۔